BASHIR AHMAD NAHVI KI ELMI-O-ADBI KHIDMAAT

A Dissertation Submitted to the University of Hyderabad in Partial Fulfillment of the Requirement for the Award

DOCTOR OF PHILOSOPHY IN URDU

BY GULZAR AHMAD DAR

SUPERVISED BY

Dr.NISHATH AHMED

DEPARTMENT OF URDU

SCHOOL OF HUMANITIES

UNIVERSITY OF HYDERABAD

HYDERABAD-500046

MARCH 2016

CERTIFICATE

This is to certify that dissertation entitled **'BASHIR AHMAD NAHVI KI ELMI-O-ADBI KHIDMAAT'** submitted by **Gulzar Ahmad Dar,** bearing Regd. No. **13HUPH01** in partial fulfillment of the requirement for the award of the degree of Doctor of Philosophy in Urdu is original and the work has been carried out by him under my supervision and guidance. The dissertation has not been previously in part or in full submitted for any degree or diploma to this University or any other institution.

Hyderabad

Date:

Dr.Nishath Ahmed

Research Supervisor

HEAD

Department of Urdu

University of Hyderabad

Hyderabad

500046

DEAN

School of Humanities

University of Hyderabad

Hyderabad

500046

DECLARATION

I hereby declare that the work embodied in this dissertation entitled **'BASHIR AHMAD NAHVI KE ELMI-O-ADBI KHIDMAAT'** is carried out by me under the supervision of **Dr.Nishath Ahmed**, Department of Urdu, University of Hyderabad, is original and this has not been submitted for any other degree to this University or any other University. I hereby agree that my dissertation can be deposited in shodganga / INFLIBNET.

Hyderabad   Gulzar Ahmad Dar

Date:

فہرست ابواب

پیش لفظ

باب اوّل: کشمیر میں اردو ادب کا سماجی، تہذیبی اور ادبی پس منظر: ۹۔ ۴۳

باب دوم: بشیر احمد نحوی کے سوانحی حالات وشخصیت : ۴۴۔ ۶۹

باب سوم: بشیر احمد نحوی کے معاصرین کا اجمالی جائزہ: ۷۰۔ ۱۱۸

باب چہارم: بشیر احمد نحوی کی علمی وادبی خدمات: ۱۱۹۔ ۲۶۱

باب پنجم: بشیر احمد نحوی مشاہیر، ناقدین ومعاصرین کی نظر میں: ۲۶۲۔ ۲۸۴

اختتامیہ ۲۸۵۔ ۲۸۹

کتابیات ۲۹۰۔ ۲۹۵

پیش لفظ

یہ ایک تلخ مگر اٹل حقیقت ہے کہ انسانی زندگی کی مقدار علم کی وسعتوں کے مقابلے میں بے حیثیت ہے۔ ایک انسان کو اگر بفرض محال ایک زندگی کے بجائے کئی زندگیاں بھی نصیب ہوں، تب بھی وہ علم و تحقیق کے بحر و خار میں سے ایک قطرے سے زیادہ حاصل نہیں کر پائے گا۔علم کی ان وسعتوں میں نشاۃ ثانیہ کے بعد جو حیرت انگیز اضافہ ہوا، اسے بجا طور پر علمی دھماکہ کہا جاسکتا ہے۔اس صورتحال سے عہد برآ ہونے کا طریقہ یہ ہے، کہ ہر آدمی اپنے لئے علم کا کوئی چھوٹا سا گوشہ منتخب کر کے، اسی کے اندر اختصاص حاصل کرے۔ یہ طریقہ بے شک حقیقت پسندانہ بھی ہے اور مفید بھی، جب مختلف علماء و فضلاء مختلف شعبۂ ہائے علوم میں اختصاص حاصل کریں گے، تو ان کے مجموعی مساعی سے علم کا ہمہ جہت اور ہمہ گیر ارتقاء صحیح نہج پر جاری رہے گا۔

مذکورہ بالا عبارت کے پیش نظر یہاں پر جو ہر لال نہرو کا یہ قول درج کرنا ضروری سمجھتا ہوں، کہ ایک آدمی کو تیس سال کی عمر تک ہر شعبۂ علم کے بارے میں کچھ نہ کچھ جان لینا چاہئے

اور تیس سال کے بعد کسی ایک شعبۂ علم کے بارے میں سب کچھ جاننا چاہیئے۔ اگر اس قول کی عہد برائی اور ترقی یافتہ شکل دیکھا جائے' تو ہمارے یہاں مختلف جامعات میں مختلف شعبۂ جات میں سندی تحقیق کے تحت ایم۔فل اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے پروگرام چلائے جاتے ہیں۔ان پروگراموں کے تحت مختلف امیدواروں سے مختلف موضوعات پر کام کروایا جاتا ہے' اور اس طرح وہ امیدوار اپنے اپنے موضوعات کے حوالے سے کما حقہ واقفیت حاصل کر کے اس میں اختصاصی مہارت حاصل کرتے ہیں۔

یہاں پر یہ بات بتاتا چلو' کہ موضوع کے انتخاب کے سلسلے میں باضابطہ طور پر کمیٹی (متعلقہ شعبۂ) بٹھائی جاتی ہے' جس میں امیدوار اپنی پسند کے چند موضوعات پیش رکھتا ہے اور کمیٹی روبرو امیدوار کی قابلیت' علمی لیاقت اور موضوعِ تحقیق دیکھ کر اسے کسی ایک موضوع پر کام کرنے کی اجازت دیتی ہے۔راقم السطور نے پی۔ایچ۔ڈی میں داخلے کے بعد حسب دستور موضوع کے انتخاب کے سلسلے میں چند موضوعات کی فہرست کمیٹی کے سامنے پیش کیں' جہاں پر راقم کی علمی اور ادبی صلاحیتوں کے پیش نظر ''بشیر احمد نحوی کی علمی و ادبی خدمات'' کے موضوع پر کام کرنے کی منظوری و اجازت دی گئی۔

پروفیسر بشیر احمد نحوی وادی گلپوش' کشمیر جنت نظیر کی اس جواں سال قد و قامت رکھنے والی مجسمہ خلق کریم، دل و دماغ کو فرحت بخشنے والی شخصیت کا نام ہے' جو جامعہ کشمیر میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کے ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے مشاط آرز وکوتر وتازہ کرنے والی نہ صرف منصب اعلیٰ پر بلکہ منصب تقدس پر تعینات ہے۔ پروفیسر نحوی خون اور گوشت و پوست کے پیکر میں اعلیٰ

جینس کے وارث نظر آتے ہیں' جو صرف حسن بکھیرتا ہے۔ پروفیسر بشیر احمد نحوی نے ہوش سنبھالتے ہی اعلیٰ خاندانی وقار کا ورثہ لیا اور عالم شباب کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی ضبط نفس اور پاک دامنی کو اختیار کیا۔ دانشگاہ علم وعرفان کے زینے پر آ کر بشیر احمد نحوی نے حسان بن ثابت ؓ کی قدم بوسی ومشیعتِ نقش قدم کی۔ انہوں نے جو کچھ لکھا وہ علم وآ گہی حق کی طرف داری میں لکھا ہے۔ اخلاق کریمانہ کا یہ سخی فیاض حلم وعلم کی صحیح تشریح جانتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے' کہ حلیمی سورۃ رحمن کا آہنگ کیا ہے۔ اس آہنگ کو اپنا شعار بنانے والا نحوی اس صفت میں انجیل کی دعا کی نرمی کی آویزش کرتے ہوئے' جب تواضع واحترام آدمیت کا فریضہ ادا کرتا ہے' تو گنبد سے پہلے مینار یاد آ جاتا ہے۔ تفریق فوق و پست کو نیست ونابود کرنے والا یہ استاد قلم کا وہ حقدار' وارث اور دوست ثابت ہوتا ہے' جو ذہانت کے تمام مرحلوں سے گزر کر اوج قلم پر ایسے بندھ جاتا ہے کہ قلم اور بشیر احمد نحوی ایک دوسرے سے گلے لگ کر علم بن گئے۔

تحقیق کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی' جس پہلی منزل سے گزرنا پڑتا ہے وہ مواد کی فراہمی کے حوالے سے تلاش وجستجو ہے۔ اس مرحلے میں راقم السطور نے بڑی محنت سے چند ہی مہینوں میں سارا بنیادی' ثانوی مواد اور انٹرویو جمع کئے تھے' لیکن جو دشواری بعد میں آئی' اسے تقدیر کی ستم ظریفی کہیے، یا آزمائش الٰہی کہ ستمبر ۲۰۱۴ء میں وادئ کشمیر ایک آفت عرض و سماوی (سیلاب) میں آ کر تباہ ہوگئی اور ایسی خستہ حال ہوئی کہ کچھ مذکور نہیں۔ اس تباہی کی زد میں راقم کا گھر بھی آ گیا۔ اس کی صاف صاف عکاسی امیر مینائی کے ان اشعار سے کی جاسکتی ہے۔

گھر کھدنے کی پوچھو نہ مصیبت ہم سے
روتے ہے لپٹ لپٹ کے حسرت سے ہم
یا ہم جاتے ہے گھر سے رخصت ہو کر
یا گھر ہوتا ہے آج رخصت ہم سے

اس لٹے ہوئے گھر میں دنیاوی جاہ وحشم کے ساتھ میرا ایک ذاتی کتب خانہ بھی تھا، جو کھچا کھچ کتابوں سے بھرا پڑا تھا۔سب سے بڑی بات یہ کہ اس میں میرا تمام پی۔ایچ۔ڈی مواد بھی جمع تھا۔اس طرح یہ مواد بھی ضائع ہوگیا۔ایسی صورت حال دیکھ کر میرے پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ میں اپنی ہمت ہارنے لگا، ایسے میں میرے کرم فرماؤں، جن میں خاص کر میرے نگراں جناب ڈاکٹر نشاط احمد اور میرے مشفق استاد جناب ڈاکٹر جوہر قدوسیؔ نے میرے حوصلے بڑھائے اور مجھے احساس کمتری سے بچایا۔ایک لڑکھڑاتے ہوئے پرندے کے مانند راقم نے پھر سے وہ دانے چننے شروع کئے۔ اس طرح پھر سے جان فشانی کے بعد دوبارہ وہ مواد تلاش کیا اور نوٹس لینے شروع کئے۔اپنے آخری پڑاؤ پر پہنچے کے بعد راقم نے اسے ترتیب دے کر اس کا ایک مکمل مسودہ تیار کیا۔ابتدائی حذف واضافے کے بعد اپنے مقالے کو پایہ تکمیل تک پہچانے میں خاص کر میرے نگراں جناب ڈاکٹر نشاط احمد، اپنی ڈاکٹورل کمیٹی کے ممبران، جن میں صدر شعبہ اردو پروفیسر مظفر علی شہ میری، ڈاکٹر عرشیہ جبین، کے علاوہ اپنے مشفق استاد جناب پروفیسر محمد انورالدین اور دیگر دوستوں کے نیک مشوروں نے خاطر خواہ اضافہ کیا۔

راقم الحروف نے اس مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

پہلا باب: کشمیر میں اردو ادب کا سماجی، تہذیبی اور ادبی پس منظر'' کے عنوان کے تحت ہے۔اس باب میں کشمیر میں اردو ادب کے سماجی، تہذیبی اور ادبی پس منظر کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔کشمیر میں چلی آرہی ادبی روایت کو تاریخ کے آئینے میں پیش کیا گیا ہے۔ تاریخ کے اورق کی ورق گردانی کے بعد ہمیں اس بات کا انکشاف ہوتا ہے، کہ ریاست میں کن عوامل کے پیش نظر اردو ادب کو پھلنے اور پھولنے کا موقعہ ملا۔ ہماری آنکھوں کے سامنے ریاست کے وہ تاریخ ساز واقعات بھی رقص کرتے دیکھائی دیتے ہیں۔جنہوں نے ریاست کے تمام شبعۂ جات کو متاثر کیا ہے اور اس کا اثر آج بھی ہماری زندگیوں پر نظر آتا ہے۔اس اثر ونفوض اور ردِ عمل اور درد و کشمکش کی داستان کا اظہار ہمارے ادب بالخصوص اردو ادب میں ہر جگہ نمایاں ہیں۔

باب دوم: بشیر احمد نحوی کے سوانحی حالات وشخصیت کے عنوان کے تحت ہیں۔اس میں بشیر احمد نحوی کی ولادت سے لیکر عصر حاضر تک ان کے حالات و واقعات کو بیان کیا گیا ہے۔ نیز ان کے حسب ونسب، پیدائش، ابتدائی تعلیم، اعلیٰ تعلیم، ملازمت کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ان کی شخصیت کے تحت ان کے حلیہ، ذوق شوق، عادات واطوار، مزاج، رہن سہن مشاغل وغیرہ کا جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

باب سوم: بشیر احمد نحوی کے معاصرین کا اجمالی جائزہ کے عنوان کے تحت ہے۔مقالے کے اس باب میں بشیر احمد نحوی کے معاصرین کا شخصی اور تاثراتی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

باب چہارم: بشیر احمد نحوی کی علمی وادبی خدمات کے عنوان کے تحت ہے۔یہ مقالے کا

بنیادی اور اہم باب ہے۔ اس میں بشیر احمد نحوی کی علمی و ادبی خدمات کا تفصیلی جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نیز ان کے دور نظامت میں ہوئے مختلف ادبی سمیناروں، مباحثوں، ان کی نگرانی میں ہوئے مختلف تحقیقی مقالوں کا تذکرہ، ان کی تحقیقی وتنقیدی تصنیفات و تالیفات اور ان کے متفرق مضامین کا مفصل جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

باب پنجم: بشر احمد نحوی مشاہیر، ناقدین و معاصرین کی نظر میں کے زیر عنوان ہے۔ اس میں بشیر احمد نحوی کے حوالے سے مختلف مشاہیر، ناقدین و معاصرین کی آراؤں کو پیش کیا گیا ہے۔ جو وقتاً فوقتاً ان کے لئے رطب السان ہوئے ہیں۔

راقم السطور خداوند کریم کی حمد وثناء کے بعد ان تمام معتبر شخصیات کا شکر گزار ہیں، جن کی دعاؤں اور مدد سے میرا یہ تحقیقی کام پائے تکمیل تک پہنچا۔ میں سب سے پہلے اپنی والدہ صاحبہ کا ممنون ومشکور ہوں، جن کی خاموش طبیعت نے مجھے زبان دی، ساتھ ہی اپنے والد صاحب کا بھی شکر گزار ہوں، جن کی محنت میرے لئے ہمیشہ inspiration کا کام دیتی رہی۔ میں اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کا شکر گزار ہوں۔ جنہوں نے مجھے کسی چیز کی کمی واقع نہیں ہونے دی۔ میں اپنے تمام دوستوں اور احباب خاص کر محمد سلیم اور جسمینہ سلیم، عبدل عادل پرے کا بے حد شکر گزار ہوں، جنہوں نے وقتاً فوقتاً قدمے، سخنے، درہمے میری مدد فرمائی۔

میں اپنے نگراں ڈاکٹر نشاط احمد کا بے حد ممنون ومشکور ہوں، جنہوں نے میری رہنمائی کی اور قدم قدم پر مجھے اپنی قیمتی آراء سے نواز کر میرے کام کو آسان بنا دیا۔ اس کے ساتھ

ساتھ اپنی کمیٹی ممبران کے علاوہ شعبۂ اردو کے تمام باذوق اساتذہ صاحبان کا شکر گزار بھی ہوں، جن سے وقتاً فوقتاً بہت کچھ سیکھنے کا موقعہ ملا۔

آخر پر میں ایک بار پھر صدر شعبۂ اردو پروفیسر مظفر علی شہ میری کے ساتھ ساتھ شعبۂ اردو کے اس کاروان علم وادب کے علمبرداوں کو، جن میں پروفیسر رضوانہ معین، ڈاکٹر حبیب نثار صاحب، ڈاکٹر عبدالرب منظر، ڈاکٹر عرشیہ جبین صاحبہ، ڈاکٹر محمد کاشف، ڈاکٹر ذاہد الحق، ڈاکٹر رفیعہ بیگم صاحبہ کا عمیق گہرائیوں سے شکر گزار ہوں۔ جن کی قیمتی آراء ہمیشہ نوآموز طلباء کے لئے سودمند ثابت ہوئی ہیں اور انشااللہ آگے بھی ہوں گی۔ میں آپ سب کا ممنون ومشکور ہوں۔ آخر پر میں آپ سب کا ایک بار پھر شکریہ ادا کرتا ہوں اور ساتھ ہی ساتھ آپ سب کے لئے دعا گو بھی ہوں۔

راقم السطور
گلزار احمد ڈار

حیدرآباد
مارچ ۲۰۱۶

باب اول

کشمیر میں اردو ادب کا سماجی، تہذیبی اور ادبی پس منظر

ہماری تہذیب صدیوں کی مذہبی، سیاسی اور سماجی تحریکات اور تاریخی انقلابات کا نتیجہ ہے۔ آریوں کی ہندستان میں آمد کے بعد ایرانی، یونانی، عرب، ترک، مغل، پرتگالی، ڈچ، فرانسیسی، انگریز یکے بعد دیگرے یہاں آتے رہے اور ان کے باہمی میل جول سے ہندستانی تہذیب مرتب ہوتی رہی۔ ایشیائی اقوام نے ہندستان میں مستقل سکونت اختیار کر کے اس کو اپنا وطن بنایا' یہی وجہ ہے کہ ایشیائی اقوام کی تہذیبوں کے مستقل اثرات نظر آتے ہیں۔ ساتھ ہی مغربی تہذیب کے اثرات بھی ہیں لیکن ان میں اتنی گہرائی اور گیرائی نہیں ہے۔ صدیوں میں تشکیل پذیر اس مشترکہ تہذیب کی تعمیر میں ہندستانی زبانوں کا بڑا اہم رول ہے۔ چنانچہ تہذیبی عناصر کے لین دین کے ساتھ ساتھ زبانیں بھی بنتی' سنورتی اور نکھرتی گئیں۔ سنسکرت جیسی ترقی یافتہ' ادبی اور علمی زبان وجود میں آئی اور ساتھ ہی ساتھ عوام میں پراکرتوں نے

جنم لیا اور پھلتی پھولتی گئیں اور آہستہ آہستہ اُپ بھرنش کا وجود ہوا۔ یہی اُپ بھرنش مختلف خطوں میں بولی جاتی تھی اور ادبی زبان کا درجہ بھی حاصل کر چکی تھی۔ دہلی اور آگرہ میں کھڑی بولی اور برج بھاشا کا رواج تھا۔ کھڑی بولی کو مرکزی حیثیت حاصل ہوئی اور مسلمانوں کے آنے کے بعد اس میں فارسی، ترکی، عربی، افغانی الفاظ شامل ہوتے گئے اور ایک نئی زبان کا روپ دھار کر آگے بڑھتی گئی۔ نئی زبان کبھی ہندی کہلائی، کبھی لشکر، کبھی ریختہ اور کبھی اردوئے معلٰی اور آخر میں اُردو زبان کہلائی۔

ہندستانی تہذیب کے ارتقاء کے ساتھ ہی اس زبان کا بھی ارتقاء ہوا۔ اس کا ادب پروان چڑھا اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو ادب اور اردو زبان ہندستان کی گنگا جمنی تہذیب، یہاں کے مختلف و متنوع جہانِ رنگ و بو کی حقیقی نمائندہ ہے۔ اس کے سب سے پہلے فنکار کے کلام میں بھی ہندستانی زندگی کے مذہب و ثقافت، تاریخ و تہذیب اور وطنی و قومی احساسات و جذبات کے جیتے جاگتے مرقعے پائے جاتے ہیں۔ یہ زبان و ادب تمام گزشتہ اور موجودہ تہذیبوں کا سنگم ہے، جو سندھ، وادی ستلج، جہلم، گنگا و جمنا، کاویری کرشنا، برہم پتر جیسے عظیم دریاؤں، مشرقی و مغربی ساحلوں، نئے اور پرانے شہروں اور قصبوں میں پروان چڑھتی رہی۔ اس میں سنسکرت برج، کھڑی، اودھی، مراٹھی، گجراتی، تیلگو، بنگالی، فارسی، ترکی، عربی، انگریزی، فرانسیسی، پرتگالی، چینی، روسی نے اپنا رس گھولا، اس کو بانکپن عطا کیا اور اس کو سماجی زندگی کی اہم ضرورت کے طور پر وسعت دی۔ جیسا کہ ابوالفیض سحر اپنے مضمون ''نثر صحت زبان کی کسوٹی''، میں لکھتے ہیں:

''زبان محض اظہار وخیال کا ذریعہ ہی نہیں، بلکہ سماجی زندگی کی اہم ضرورت اور تہذیبی ارتقا کا ایک رشتہ خیز وسیلہ بھی ہے'' ۱؎

اردو زبان وادب کا اثاثہ ابتداء سے ہی ہندستانی سرزمین کا سچا آئینہ دار رہا ہے۔ ہندستانی تہذیب اور اردو ادب ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں۔ زبان کے ساتھ تہذیب کا تعلق ہی اس کو زندہ رکھ سکتا ہے۔ تہذیبی قدریں زبان وادب کی قدروں سے الگ نہیں ہوتیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر عابد حسین اپنی کتاب ''قومی تہذیب کا مسلہ'' میں رقم طراز ہیں:

''تہذیب نام ہے اقدار کے ہم آہنگ شعور کا، جو ایک انسانی جماعت رکھتی ہے، جسے وہ اپنے اجتماعی ادراک میں ایک معروضی شکل دیتی ہے، جسے افراد اپنے جذبات ورجحانات، اپنے بہاؤ اور برتاؤ میں اور ان اثرات میں ظاہر کرتے ہیں، جو وہ مادی اشیاء پر ڈالتے ہیں۔'' ۲؎

تہذیب کا وجود، اس کی بقائ، اس کی رویت اور اقدار کا تحفظ زبان ہی کرتی ہے۔ یہ بات عیاں ہے کہ اردو زبان وادب ہندستانی تہذیب کی رہین ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر جوہر قدوسیؔ کی کتاب ''کشمیر میں اردو زبان وادب کی ترویج میں صحافت کا رول ۱۹۴۷ء کے بعد'' کا یہ اقتباس قابل ذکر ہے:

یہ (اردو) اپنی ساخت میں بین الاقوامی مزاج کی مخلوط زبان ہے۔ اس کا بنیادی ڈھانچہ اگرچہ مقامی ہے، لیکن اس میں دنیا کی

مختلف زبانوں کے الفاظ اتنی تعداد میں داخل ہو گئے ہیں کہ یہ

اپنی اساس میں بین الاقوامی زبانوں کی ایک انجمن بن گئی

ہے۔''۳؎

یہ بات عیاں ہے کہ اردو زبان تمام ملکی اور جغرافیائی حدود و قیود کو پھاند کر سرعت سے پورے عالم میں اپنی جگہ بنا رہی ہے اور فصیح الملک مرزا داغ دہلوی کے درج ذیل شعر کے مصرعہ ثانی میں ان کی روح سے معذرت کے ساتھ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے:

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ

سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

عالمی سطح پر اردو زبان و ادب کی سماجی' تہذیبی اور ادبی صورتحال کے متذکرہ بالا مختصر تذکرے کے بعد اب ہم ریاست جموں وکشمیر میں اردو ادب کا سماجی' تہذیبی اور ادبی پس منظر کے حوالے سے جائزہ لیں گے۔

دیکھا جائے تو یہ سرزمین (ریاست جموں وکشمیر بالخصوص کشمیر) جہاں اُگنے والی گھاس بھی' بقول شیخ یعقوب صرفیؔ زعفران کا رنگ اور خوشبو لے کر آتی ہے' اردو کے پودے کو بڑی راس آئی اور اس نے یہاں کی مٹی کی طرح یہاں کے زرخیز ذہنوں سے نمو پا کر تخلیق وتحریر کا ایک گھنا جنگل اُگا دیا۔ غالبؔ نے اس شعر میں شاید ایسی ہی ذہنی مناسبت اور اپج کی خاصیت کو بیان کیا ہے۔ ؎

مستی باد صبا سے ہے بغرض سبزہ

کاٹ کر پھینکیے ناخن تو انداز ہلال
قوت نامید اس کو بھی نہ چھوڑے بے کار
غالبؔ

ریاست میں اردو زبان کافی عرصے سے افہام وتفہیم، ترسیل وابلاغ، تعلیم وتدریس اورتخلیقیت کے ایک موثر وسیلے کا کام انجام دیتی رہی ہے۔اس حوالے سے پروفیسر عبدالقادرسروری لکھتے ہیں:

''اردو کی عمر ریاست میں تحریری سطح پر ڈیڑھ سو برس سے زیادہ نہیں ہے اورتخلیقی سطح پرتو یہ قدرتی طوراوربھی مختصر ہے ۔ یہ کسی زبان اوراس کے ادب کے برگ وباراور پھولنے پھلنے کے لئے بہت ہی کم عرصہ ہے۔'' ۴؎

تاریخ کے سینے پرکشمیرکا سماجی، تہذیبی، سیاسی اورادبی ورثہ اس کے ماضی سے لےکر حال تک کےتمام نشیب وفراز کی داستان خودسناتا ہے۔ بقول پروفیسرعبدالقادرسروری:

''کشمیرقدیم زمانے سےعلم وفن کی طرح فنون لطیفہ کی پیدائش اورافزائش کا مرکز رہاہے۔کشمیر کے فنکاروں کی ذہانت، رقص وسرور، ناٹک کاری، تعمیر نقاشی اورخطاطی جیسے متنوع موضوعات

میں نمایاں رہی ہے۔ یہ کشمیر کے ماحول کا ایک لازمی نتیجہ تھا ۔کشمیر کے بلند کوہستان، عمیق وادیاں، پھوٹتے ابلتے چشمے، بہتے گنگناتے آبشار، شاداب مرغزار، حسین چنار، سروشمشاد کو مات دینے والے سفیدوں کی قطاریں، رنگ برنگ پھول اور ان کے شوخ رنگ، صورت میں حسین اور مزے میں لذیذ پھل، یہ فطرت کے حسن کی خوبی کے اجزاء کا ایسا اجتماع ہے کہ کسی صاحب ذوق کے لئے دعوت نظر نہ بنے اور اس میں مضمر فنکار کو منظر عام پر نہ لائے تو حیرت کی بات ہوگی۔'' ۵ ۔

اپنے قدرتی حسن کی وجہ سے کشمیر ہمیشہ بدیسی حکمرانوں کی توجہ کا مرکز رہا ہے اور انہی حکمرانوں اور سلاطین کی زیر دستی کشمیر کی سماجی، سیاسی، تاریخی، تہذیبی، ثقافتی اور ادبی جہان، مختلف ادوار میں مختلف صورتوں میں نشونما پاتا رہا ہے اور پروان چڑھتا رہا۔اس سرزمین میں ، ہمیں ایسا دور بھی دیکھنے کو ملتا ہے جو شاید ہی عالمی تاریخ میں رونما ہوا ہو، جب ایک قوم کے تمام مرد وزن اور پیر و جوان کو معہ مال واسباب و جائیداد کے ساتھ فروخت کیا گیا۔ یہ واقعہ امرتسر کا معاہدہ تھا، جب گلاب سنگھ نے انگریزوں سے کشمیر کو خرید لیا۔اس بدنام زمانہ معادہ کا تذکرہ ڈاکٹر محی الدین قادر زور کشمیری اپنے مضمون'' ''تحریک آزدی ہند اور جموں وکشمیر کے اردو شعرائ'' میں اپنے موثر انداز میں یوں کیا ہے:

کشمیر کی تاریخ بہت پرانی ہے۔۔۔البتہ کشمیر کی تاریخ میں ایک

بدنما داغ ہمیں اس وقت نظر آجاتا ہے، جب ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء
میں امرتسر معاہدے کے تحت مہاراجہ گلاب سنگھ نے پچھتر لاکھ
نانک شاہی روپیوں کے عوض کشمیر کو انگریزوں سے خرید لیا
تھا۔'' ۶؎

شاعر مشرق، سپوت کشمیر علامہ اقبال اس کا شدید طنز کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

دہقان و کشت و جوئے وخیاباں فروختند
قومے فروختند وچہ ارزاں فروختند

یہ دور اگرچہ سیاسی وسماجی اعتبار سے انحطاط پذیر دور تھا لیکن اردو زبان وادب کے حوالے سے ایک امید افزاء دور تھا۔ ڈاکٹر جوہر قدوسی نے اپنی کتاب ''کشمیر میں اُردو زبان وادب کی ترویج میں صحافت کا رول ۱۹۴۷ء کے بعد'' میں اس حوالے سے لکھا ہے:

''ریاست جموں وکشمیر میں اردو کی آمد کے بارے میں کسی خاص
تاریخ کا تعین ناممکن ہے، تاہم یہ بات یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے
کہ ۱۸۴۶ء میں جب مہاراجہ گلاب سنگھ (۱۸۴۶۔۔ ۵۴)
نے کشمیر کو خرید کر جموں وکشمیر پر مشتمل متحدہ ریاست کی بنیاد ڈالی
تو اردو عوام کی بول چال اور تعلیمی اداروں میں راہ پانے لگی تھی''
۷؎

یہ حقیقت اس کے باوجود اپنی جگہ اہم ہے کہ ایک عرصے سے کشمیر میں فارسی زبان و

ادب نے سنسکرت کو ہٹا کر اپنی جگہ بنالی تھی اور فارسی کو اس وقت بھی درباری زبان کی حیثیت حاصل تھی۔ ڈاکٹر شبینہ پروین اپنی کتاب ''اردو غزل کی ثقافتی اساس'' میں لکھتی ہیں:

''کشمیر میں اسلام کی اشاعت کے بعد لسانی انقلاب کی ابتدا چودھویں صدی عیسوی میں ہوتی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب دکن میں اردو زبان لسانی تشکیل کے مختلف مراحل سے گزرتی ہوئی تخلیقی اظہار کی زبان بھی بن رہی تھی۔ کشمیری حکمران سلطان شہاب الدین کے زمانے (۱۳۵۶۔ ۱۳۷۳ء) میں سنسکرت کی جگہ فارسی نے لینی شروع کردی تھی اور بالآخر فارسی ہی کشمیر کی سرکاری اور ثقافتی زبان قرار پائی۔'' ۸ ؎

اہل کشمیر نے چودھویں صدی عیسوی میں فارسی زبان وادب کو دل کھول کر اپنا لیا اور یہاں ایسے بے شمار شعراء پیدا ہوئے، جنھوں نے فارسی ادب پر اپنے انمنٹ نقوش چھوڑے، ان حضرات میں شیخ یعقوب صرفی، شیخ بابا داوٗد خاکی، مرزا اکمل بدخشی، خواجہ حبیب اللہ نوشہری اور غنی کشمیری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ غنی کشمیری وہ شخصیت ہیں، جن سے غالبؔ جیسے شہرہ آفاق شاعر نے خوب خوب استفادہ کیا ہے۔

۱۸۴۶ء میں ڈوگرہ حکومت کے قیام کے بعد کشمیر کی لسانی اور تہذیبی صورتحال ایک ایسے جزیرے کی سی ہوکر رہ گئی تھی، جس کو ایک نئے پیچ وتاب کی لہریں چاروں طرف سے اپنی آغوش میں لے رہی تھیں۔ فارسی یہاں ایک ترقی پذیر اور استقبال آگاہ تمدن کے ہمراہ

آ ئی تھی، لیکن اب اسکی سانسیں ڈوب رہی تھیں ۔جا گیرداری سماج پر سرمایہ دارانہ نظام کی پہلی پر چھائیاں پڑ رہی تھیں اور اس کا خول ادھڑ رہا تھا۔اردو اس کے بطن سے نکلی' اگر چہ رسمی طور پر حکومت نے ۱۸۳۷ء میں فارسی کی جگہ اردو کو درباری زبان بنانے کا اعلان کر دیا' لیکن یہ عمل بہت مدت سے جاری تھا' بقول ڈاکٹر جوہر قدوسیؔ :

''یہ اتنے غیر محسوس اور بے ساختہ طریقے پر رو بہ عمل آیا کہ اسکی کوئی تاریخ مقرر کرنا سمندر کی دو ایسی موجوں کے درمیاں حد فاصل کھینچے کے برابر ہے' جو ایک دوسرے سے بغلگیر ہونے کے لئے آرہی ہوں۔'' ۹ ؎

ڈوگرہ حکومت کے قیام کے بعد سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر دہلی اور لاہور کی حکومتوں کے ساتھ ریاست کے تعلقات مضبوط سے مضبوط تر ہوتے گئے اور لوگوں کو ریاست سے باہر آنے جانے کے زیادہ سے زیادہ مواقع میسر ہونے لگے۔اسی زمانے میں اردو کو عوام میں متعارف اور مقبول کرانے میں موسیقی نے بھی اہم رول ادا کیا۔ ہندوستان سے مختلف طائفے' اہل نشاط اور پہاڑی سارنگی نواز یہاں آتے اور گھر گھر' گلی گلی' گاؤں گاؤں پھیر کر اردو غزلیں اور گیت گاتے رہتے اور ان گیتوں کو لوگ یاد کر کے ذوق وشوق سے گنگناتے تھے ایک غزل کا یہ شعر انہی دنوں زبان زد عام تھا۔ ؎

کیا خبر تھی انقلاب آسماں ہو جائے گا
یار سے ملنا نصیبِ دشمناں ہو جائے گا

تو دوسری طرف رام لیلا اور راس لیلا کے تماشے بھی کافی مقبولیت حاصل کر چکے تھے۔ ہندوستان کے مختلف شہروں سے آئے ہوئے تماشہ کرنے والے ''اے میرے پیارے برادر بن کو جانا چھوڑ دے'' جیسے گیت گا گا کر عام لوگوں میں غیر محسوس طریقے سے اردو زبان کو مقبول بنا رہے تھے۔ان گیتوں میں ہماری قومی زندگی کی سماجی' ثقافتی' تاریخی حقیقتیں پنہاں تھیں، جس نے ہمارے ثقافتی احیاء کو طاقت بخشی۔

مہاراجہ گلاب سنگھ نے ۱۸۵۶ء میں ریاستی حکومت کی باگ ڈور اپنے جانشیں رنبیر سنگھ کو سونپ دی تو رنبیر سنگھ نے ریاستی نظم ونسق کو برطانوی ہند کے معیاروں پر لانے کی گراں قدر کوششیں کیں۔اور ریاست کی تہذیبی اور ادبی زندگی میں نمایاں تبدیلیاں ہونے لگیں۔ پروفیسر سروری لکھتے ہیں:

''۱۸۵۷ء کے بعد کا زمانہ نئی تعلیم اور نئی روشنی کا زمانہ تھا جس کا اصول عقلیت پسندی اور جس کا ذریعہ جدید زبانیں تھیں اور ان میں اردو سب سے پیش پیش تھی۔'' ۱۰؎

اور ڈاکٹر جوہر قدوسیؔ اس کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مہاراجہ نے وقت کے تقاضوں کے مطابق نئے علوم وفنون اور نیا تعلیمی نظام رائج کروانے کے لئے احکامات جاری کئے اور انگریزی زبان کے ساتھ ساتھ تعلیمی اداروں میں اردو بھی پڑھائی جانے لگی۔ نئے علوم وفنون کو اردو' ڈوگری' ہندی وغیرہ

میں منتقل کرانے کیلئے مہاراجہ نے ایک دارالترجمہ قائم کیا، جس

کے زیر اہتمام بہت سی علمی کتابوں کے ترجمے کئے گئے۔'' ۱۱؎

مہاراجہ نے اپنی دلچسپیوں کے تئیں تار برقی ٹیلی گراف کے لئے اردو الفاظ کے استعمال کا حکم دیا اور ساتھ ساتھ اس کے قائم کردہ ''دارالترجمہ'' میں ''بدیابلاس'' پریس بھی قائم کیا، جہاں سے بعد میں اسی نام سے ایک سرکاری گزٹ بھی جاری کیا گیا۔

مہاراجہ کے قائم کردہ دارالترجمہ کے دائرہ عمل سے باہر بھی علمی اور ادبی سرگرمیوں میں ریاستی سرکار کے محکمہ جات اور غیر سرکاری سطح پر لوگ برابر حصہ لے رہے تھے۔ اس دور کی ادبی سرگرمیوں پر نظر ڈالی جائے تو ہمیں کئی اچھے شاعر اور نثر نگار ملتے ہیں، جو ہندی کے علاوہ اردو میں لکھتے تھے۔ ان میں سب سے پہلے مہاراجہ کے ایک وزیر سردار دیوی سہائے تھا۔ انہوں نے ۱۸۸۰ء میں 'ہندو کلاسیکل ڈکشنری' لکھی جو اس وقت اہم تصنیف مانی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور پنڈت دیوان شیو ناتھ کول منتظرؔ تھے، اردو میں ان کی ایک کلیات یادگار ہے جس میں غزلیں، قصائد اور مناجات کے علاوہ شہر آشوب کے طرز پر ایک مسدس ''شکوہ چرخ'' بھی شامل ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔ ؎

دہن زخم اپنا وا نہ ہوا

ہائے حق نمک ادا نہ ہوا

دل کو اپنے ہے جستجو اس کی

جو کبھی صورت آشنا نہ ہوا

اس کے علاوہ روپہ بھوانی، محمود گامی، پرمانند، لکھمن جو نا گامی بلبل، واسہ کول وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اسی دور میں کشمیری زبان کے شاعر رسول میرؔ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اردو میں بھی ایسے شعر کہے ہیں، جنہیں ریختہ کہنا بجا ہوگا۔ اسی دور میں مشہور مورخ پیر غلام حسن کھو یہامی کی مشہور تصنیف 'تاریخ کشمیر' جو فارسی میں ہے' کی دوسری جلد کا ترجمہ پنڈت مادھو جان نے اردو میں کیا۔ اس کا مخطوطہ بقول پروفیسر عبد القادر سروری مصنف 'کشمیر میں اردو' ایس پی پبلک لائبریری سرینگر میں موجود ہے۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے قائم کردہ پریس سے جو سرکاری گزٹ نکلتا تھا' وہ ضرورتِ وقت کے حساب سے ناکافی تھا' اس لئے بہت سے اہل قلم کو عوامی سطح پر ایک اخبار شائع کرنے کی خلش ستارہی تھی۔ یہ لوگ مہاراجہ کے دربار میں اس غرض سے درخواستیں پیش کرتے' لیکن مہاراجہ کی پابندیوں اور سخت روّیہ کی وجہ سے یہ لوگ ریاست سے باہر کے کئی شہروں میں رہ کر اخبارات نکالنے پر مجبور ہو گئے اور اس طرح اپنی ریاست کی نمائندگی کرتے رہے۔ ان میں پنڈت سالگرام کول سالک اور ان کے بھائی ہرگوپال خستہ' اخبار عام' خیر خواہ کشمیر' مراسلہ کشمیر اور پبلک نیوز وغیرہ وغیرہ اخبارات جاری کرتے ہیں۔ یہ اخبارات اپنی نوعیت کے اعتبار سے اصلاحی مقصد رکھتے تھے۔ پنڈت ہرگوپال خستہ کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ وہ شبلی اور حالی کے ہمعصر تھے۔ انہوں نے اردو نثر میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر جوہر قدوسیؔ لکھتے ہیں:

''ان کی کتاب ''گلدستہ کشمیر'' ایک قابل قدر نثری کارنامہ ہونے

کے علاوہ اردو میں کشمیر کی تاریخ پر غالباً پہلی کتاب ہے۔[۱۴]

اس کتاب کے دیباچہ میں خستہ نے کئی اور تصانیف کا تذکرہ کیا ہے، جن میں گوپال نامہ، چہار گلزار، شگفتہ بہار، گل بہار اور سوانح عمری خستہ شامل ہیں۔ خستہ نے اس کے علاوہ فارسی اور اردو میں شعر بھی کہے ہیں۔ ان کی غزل کا ایک شعر ملاحظہ ہو: ؎

کیا بھروسہ ہے دم کا اے آدم
دم تو ہر دم گیا ہوا دیکھا

خستہ کی ایک کتاب گلزارِ فوائد ہے جو بقول ڈاکٹر جوہر قدوسیؔ ڈپٹی نذیر احمد کی کتاب 'مراۃ العروس' کے اتباع میں لکھی گئی۔ اس کے علاوہ کشمیر کی مشہور لوک کہانی ''ہی مال'' کا منظوم اردو ترجمہ بھی ہے۔

اس عہد کے دوسرے اہم نثر نگار، صحافی، شاعر اور قانون دان خستہ کے بھائی پنڈت سالگ رام سالک ہے، جو صاحب دیوان ہونے کے علاوہ متعدد تصانیف کے مالک ہیں۔ ان کی غزل سے ایک نمونہ ملاحظہ ہو: ؎

گرداب محبت سے ہوا کوئی نہ جاں بر
یہ وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں ہوتا
کعبہ دل میں مرے گھر ہے بتوں کا سالکؔ
بت ہے کعبہ میں میرے، کعبہ ہے میخانہ میں

اس کے بعد مہاراجہ رنبیر سنگھ کے جانشین مہاراجہ پرتاپ سنگھ کا دور آتا ہے۔ مہاراجہ

پرتاپ سنگھ کی عدم دلچسپیوں کی وجہ سے اردو کے حوالے سے کوئی ٹھوس اقدام نہیں اٹھائے گئے۔البتہ اردو کو ۱۸۸۵ء میں سرکاری زبان کا درجہ دیا جاتا ہے۔

دراصل اردو کی بڑھتی ہوئی مقبولیت رنبیر سنگھ کے زمانے سے ہی عیاں تھی' جہاں سے تعلیمی' ادبی' علمی اہمیت کے پیش نظر اردو کو ذریعہ تعلیم اور ادبی اظہار کا وسیلہ مل گیا تھا۔اب اس کے تیز بہاؤ کو روکنا ناممکن تھا۔ دوسری طرف ریاست سے باہر سیاسی حالات ایک نئی کروٹ لے رہے تھے اور جاگیردارنہ نظام کو ختم کرنے اور کاشتکاروں کو ان کے حقوق واگذار کرانے کے مطالبات زور پکڑ رہے تھے ۔اس نئی لہر سے ڈوگرہ حکمران نہ بچ سکے۔ ۱۸۸۷ء میں برطانوی حکام کے نئے اصولوں پر اراضی کی بندوبست کا کام شروع ہوا۔اس طرح سے کاشتکاروں کے حقوق بحال ہوئے۔اس امر کی ترجمانی ہمیں پیرزادہ محمد حسن عارف کے اس شعر سے ہوتی ہے۔ : ؎

دعائیں جان کو لارنس کے دو یہ ہے طفیل اسکے
زمینداروں کی حالت کو جو کچھ سدھرا ہوا دیکھا

۱۸۸۹ء میں درباری رقابتوں کی وجہ سے مہاراجہ پرتاپ سنگھ کو برطانوی حکومت معذول کرتی ہے۔اس سلسلے میں مہاراجہ کے حامیوں نے انگریزوں کی مخالفت اور تردید میں جم کر حصہ لیا۔ایک طرح کی ایجی ٹیشن شروع ہوئی' جس میں حصہ لینے والے اہل قلم حضرات نے بے باک انداز میں انگریزوں کے خلاف مضامین قلمبند کئے۔اس ضمن میں اخبارات نے بہت اہم رول ادا کیا۔ان میں چھپنے والے مضامین اور تبصروں کے سخت لب ولہجہ سے

ایسی ہلچل پیدا ہوئی کہ ۱۸۹۱ء میں برطانوی سرکار کو مہاراجہ کے اختیارات بحال کرنے پڑے اور ساتھ ہی ساتھ مہاراجہ کی مدد کے لئے مشاورتی کونسل بھی قائم کر دیا گیا۔علاوہ ازیں مہاراجہ نے ریاست کے لوگوں کو علمی صلاحیتوں سے مستفید ہونے کے لئے پنجاب سے کئی اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کو اپنے دربار میں بلا کر اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا' جن میں پیرزادہ محمد حسن عارفؔ اور چودھری خوشی محمد ناظر وغیرؔہ شامل ہیں۔

یہاں یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ ریاست میں اردو زبان وادب اوراس کے سماجی' تہذیبی و ثقافتی اثرات کے پھیلاؤ میں ان تھیٹریکل کمپنیوں کا رول بھی پیش پیش ہے جو ۱۸۷۵ء سے ہی ریاست میں متعارف ہوئیں۔ ایسی کمپنیوں میں خاص طور پر بقول ڈاکٹر جوہر قدوسی'' الفرڈ'' اور''البرٹ'' کمپنیاں خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ان کمپنیوں کے کھیل اس قدر مشہور ہوئے کہ ریاست کے لوگ اس کا بڑی بے صبری سے انتظار کرتے تھے۔دوسری بات یہ کہ ہندستان سے راجہ مہاراجہ اور صاحب ثروت لوگ کشمیر کی سیر کو آتے تھے۔ان میں سے اکثر گانے کے شوقین ہوتے تھے اور ان کے ذوق کی تسکین کے لئے گلوکار غالبؔ اور دوسرے شعرا کے کلام کو گاتے رہتے تھے۔اس حولے سے پروفیسر سروری لکھتے ہیں:

''غالب اور ان کی غزلیں بھی جموں اور کشمیر کے عوام سے اسی زمانے میں روشناس ہوئیں۔انہیں لوگ سڑکوں پر گاتے پھرتے تھے اور محفلوں میں انہیں قوال اور دوسرے گانے والے گا کر سناتے تھے۔'' ۱۳؎

یہ سارے واقعات رفتہ رفتہ کشمیر کو اردو کا مرکز بنانے میں ممد و معاون ثابت ہوئے اور اس میں کچھ لسانی اور کچھ تہذیبی مناسبتوں کا تقاضا بھی شامل تھا۔بقول پروفیسر عبدالقادر سروری ”جموں کی ڈوگری، اردو کی متجانس زبان ہے اور دونوں اپنا بنیادی لفظی سرمایہ ایک سرچشمہ سے پاتی ہیں۔کشمیر میں کشمیری اور اردو دونوں کا تہذیبی پس منظر ایک ہے۔اس کے علاوہ لفظی سرمایہ میں بھی فارسی کے ماخذ اور ادبی روایات مشترک ہیں۔

انیسویں صدی کے اواخر میں جن شخصیتوں نے کشمیر کی ادبی زندگی پر اپنے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں، ان میں ابوالحامد حسن ابن علی سرفہرست ہیں۔حسن صاحب دو درجن سے زائد تصانیف کے مالک تھے۔ان کا اصل کارنامہ ان کی تصنیف ”واقعات کشمیر“ مانی جاتی ہے۔پروفیسر سروری کی تحقیق کے مطابق حسن نے اس کتاب کا آغاز ۱۸۸۶ء میں کیا تھا اور اس کی کل جلدوں کی تعداد چوبیس ہے۔اور ڈاکٹر جوہر قدوسی لکھتے ہیں:

> ”اس کتاب کی مدد سے انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں کشمیر میں رونما شدہ اہم واقعات وسوانحات سے متعلق مستند حقائق ہمارے سامنے آتے ہیں“۔ ۱۴؎

ان کی دوسری اہم تصنیف میں میزان التحقیق اور رسالہ عصمت الانبیاء شامل ہیں۔اس کے علاوہ جو لوگ کشمیر کی ادبی روایت پر اثر انداز ہوئے، ان میں مولوی عبداللہ، منشی سراج الدین احمد خان، مرزا اسعد الدین سعد پیش پیش ہیں۔

منشی سراج الدین احمد نے ”انجمن مفرح القلوب“ قائم کر کے اردو زبان وادب کی

بڑی خدمت کی۔ دراصل اس انجمن کا دائرہ عمل ایک فعال ادبی وثقافتی ادارے کی طرح تھا جس کا مقصد صاحبانِ علم وادب کو جمع کرنا اور ادبی وشعری ذوق کی تسکین کا سامان مہیا کرانا تھا۔ ڈاکٹر جوہر قدوسی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''اس مقصد کے لئے انجمن کے باقاعدہ اجتماعات منعقد ہوتے تھے اور موسم بہار میں اس کی محفلیں سرینگر کے خوبصورت مغل باغات اور جھیل ڈل میں رواں دواں شکاروں میں منعقد ہوتی تھیں''۔ ۱۵؎

حبیب کیفوی ان محفلوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے مضمون بعنوان 'جموں کشمیر کی شعری محفلیں' میں لکھتے ہیں:

> ''معمول یہ تھا کہ ہفتے کو اس انجمن کے اراکین ڈونگوں میں سامان خورد ونوش لے کر ڈل کی طرف نکل جاتے۔ رات ڈونگوں میں ڈل کے کنارے بسر کرتے، صبح نشاط، شالامار، نسیم باغ یا چشمہ شاہی میں ڈیرے لگا لیتے اور تمام دن ہنسی مذاق اور شعر خوانی میں گذار دیتے''۔ ۱۶؎

اس انجمن کی کامیابی اور قدر افزائی میں باہر سے آئے ہوئے مشاہیر کا رول بھی نمایاں اور مستحسن ہے۔ علامہ اقبال، سر شیخ عبدالقادر، محمد شفیع جسٹس، شاہ دین، ملک نصر اللہ خان جیسے عظیم فن کار کشمیر آتے تو اس انجمن کے جلسوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ دوسری طرف

اس انجمن کے سرکردہ اراکین میں پیرزادہ محمد حسین عارف' چودھری خوشی محمد ناظر' صادق علی صادق وغیرہ شامل تھے۔ پروفیسر سروری لکھتے ہیں:

''اس انجمن نے نوجوانوں میں شعروادب کا ذوق پیدا کرنے کے علاوہ ایک اہم خدمت یہ انجام دی کہ اس کے اجتماعات کی بدولت کشمیر میں دوسرے سیاسی' سماجی' تعلیمی اور ادبی اداروں کے قیام کے لئے راہ ہموار ہوگئی۔'' ۱۷؎

اس دور میں کئی اور اہم شعرااور ادبا بھی پیش پیش رہے ہیں' جن میں شیخ غلام نقشبندی' مولانا عبدالقدیر بدری' قاضی عبداللہ خان ظہور' حکیم فیروز الدین فیروز' منشی غلام محمد خادم' منشی امیر الدین امیر' صادق علی خان' پنڈت واسہ کول بلبل' ضیاالدین ضیائؔ' غلام محی الدین اور مرزا اسعدالدین سعد شامل تھے۔

کشمیر میں یہ دور عوامی بیداری' سیاسی' سماجی' ثقافتی وقومی اور ساتھ ہی ساتھ اردو زبان وادب کو کشمیریوں کے قلوب واذہان میں پیوست کرنے کا سنہرا دور کہا جائے' تو بے جا نہ ہوگا۔ اس کام کو سرانجام دینے کا سہرا صحافت کے سر جاتا ہے۔ اس دور میں جن صحافیوں نے اپنی گراں قدر خدمات سرانجام دیں' ان میں محمد دین فوق (ولادت ۱۸۸۷ء) کا نام سرفہرست ہے۔ ان کے بارے میں پروفیسر نصرت چودھری لکھتی ہیں:

''محمد دین فوق نے اس میں poineering کا کام انجام دیا۔ انہوں نے اردو کے ذریعہ ہی تاریخ' سیاست' معاشرت اور

دوسرے موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا''۔۱۸؎

برج پریمی لکھتے ہیں:

''فوق کشمیر کا ایسا مایہ ناز سپوت تھا، جس نے کشمیر اور کشمیر سے باہر اپنے وطن کی ترجمانی کرنا اپنا ایمان سمجھا اور نہایت ہی شستہ اور سلیس انداز میں کشمیر کے ماضی سے بیرون کشمیر کے لوگوں کو روشناس کرانے کے لئے قلم کا سہارا لیا''۔۱۹؎

اس زمانے میں کشمیر کے اہل قلم ریاست کی پسماندگی، محکومی اور مفلسی کی تصویریں اخبار عام، خیر خواہ کشمیر، گلشن کشمیر، مراسلہ کشمیر، کشمیر درپن، کشمیری گزٹ، صبح کشمیر اور بہار کشمیر وغیرہ میں پیش کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۴ء میں ملک راج صراف نے ''رنبیر'' نام کا اخبار جموں سے جاری کیا۔ یہ اخبار بقول ڈاکٹر جوہر قدوسی ریاست کا پہلا عوامی اخبار مانا جاتا ہے۔ یاد رہے اس سے پہلے جتنے بھی اخبارات کشمیر کی عکاسی کرتے تھے، سب کشمیر سے باہر شائع ہوا کرتے تھے۔

رنبیر کے اجرا ہونے سے ریاست میں اردو زبان و ادب کے لئے نئی راہیں ہموار ہوگئیں۔ برج پریمی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''اس اخبار کی اشاعت نے اردو نثر کی توسیع اور ترقی کے لئے راہیں کھول دیں اور نئی صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقع فراہم کیا''۔۲۰؎

یہاں سے ریاست میں نثر نگاروں کی ایک بڑی جماعت پیدا ہوئی‘ جن میں پریم ناتھ بزاز‘ دیا کرشن‘ مولوی زین العابدین‘ قیس شیروانی ‘ عشرت کشتواڑی‘ غلام حیدر چستی وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔

بیسویں صدی کے نصف اول تک آتے آتے باہر سے پیدا ہوئی‘ سیاسی بیداری نے ریاست جموں وکشمیر کے دروازے پر دستک دی اور عوامی بیداری کی ایسی لہر اٹھی‘ جس نے کشمیر میں برسوں سے چلے آئے آمرانہ حکومت کے عہد یدار مہاراجہ ہری سنگھ کو کشمیر چھوڑ نے پر مجبور کیا۔ ۱۹۴۷ء میں عالمی سطح پر ہندستان اور پاکستان کے نام سے دو آزاد مملکتیں وجود میں آئیں۔لیکن ریاست میں سیاسی غیر یقینیت نے ڈیرا جما لیا‘ جو گزشتہ ۶۸ سال گزرنے کے باوجود بھی موجود ہے۔ ۱۹۴۷ء میں ہی کشمیر کا الحاق ہندستان کے ساتھ ہوا اور ریاست میں شعر وادب کے شیدائی ایک نئے عنوان ’’نیا کشمیر‘‘ کے خاکوں میں اپنی فنکاری سے رنگ بھرنے لگے۔نشاط انصاری لکھتے ہیں:

> یہ دور کشمیر کی سیاسی‘ سماجی‘ معاشی اور خاص کر تمدنی وتہذیبی زندگی کے لئے ایک عہد ساز دور کی حیثیت رکھتا ہے‘‘۔۲۱؎

۱۹۴۷ء کے بعد کشمیر میں ادبی وثقافتی سرگرمیوں کے فروغ کے لئے جو ادارے کام کرتے رہیں۔ان میں کلچرل فرنٹ اور اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔کلچرل فرنٹ ایک ثقافتی احیائے نو کا ادارہ تھا۔ڈاکٹر جوہر قدوسی لکھتے ہیں:

> ’’۔۔۔۔(یہ ادارے) جو پروگرسیو رائٹرس ایسوسی ایشن‘ تھیٹر

ایسوسی ایشن اور آرٹ ایسواسیشن کے نام سے موسوم تھے۔
ریاست کے اکثر ادباء وشعراء کلچرل فرنٹ کی مختلف اکائیوں سے
وابستہ رہے اور اپنی شعری وفکری صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے
رہے''۔ ۲۲ ؎

دوسری طرف ''کلچرل اکیڈیمی'' جس کا قیام بقول پروفیسر نصرت چودھری ۱۹۵۸ء میں عمل میں لایا گیا' نام کا ادارہ ریاست میں تمدنی اور ادبی وراثت کے احیائے نو اور خاص کر اردو ادب کی ہمہ جہت ترقی کے لئے کام کرتا رہا۔ نشاط انصاری لکھتے ہیں:

''۱۹۵۸ء میں یہاں جب فن تمدن اور زبانوں سے متعلق
اکاڈیمی کا وجود عمل میں لایا گیا تو اس ثقافتی ادارہ نے نہایت
فیاضی کے ساتھ دوسری زبانوں کے علاوہ اردو کی طرف بھی
خاص توجہ دی۔ اردو نثر ونظم اور دوسری تخلیقات کو منظر عام پر
لانے کے سلسلے میں ادارہ نے نثر نگاروں کو'افسانہ نویسوں' کہانی
کاروں اور شاعروں کو مالی امداد دینے کا سلسلہ شروع کیا۔۔۔
ادباء کی حوصلہ افزائی کے پیش نظر مالی امداد سے قطع نظر معیاری
کتابوں کی اشاعت کے لئے ہر سال انعامات دینے کی روایت
بھی کلچرل اکاڈیمی نے ہی ڈالی''۔ ۲۳ ؎

شاعری:

اس دور میں بھی شاعری ہی سرفہرست ہے جس نے کشمیر کی سماجی، ثقافتی اور ادبی میراث پر گہرے نقوش چھوڑے ۔ مجموعی طور پر اس دور کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے حامدی کاشمیری لکھتے ہیں:

> ''اطمینان کی بات یہ ہے کہ مختلف ادوار میں اہم شعری رجحانات کا اظہار کرتے ہوئے ریاست کے شاعروں نے نہ صرف فکر ونظر کی بیداری کا ثبوت بہم کیا، بلکہ اسلوب واظہار کی مروجہ خصوصیات کو بھی فنی آگاہی کے ساتھ برتنے کی کوشش کیں''۔ ۲۴ے

اس دور میں جو شعراء شعری افق پر نمودار ہوکر ادب سازی میں نمایاں کام کرتے رہے، ان میں طالب کاشمیری، مزا کمال الدین شیدا، فاضل کاشمیری، میر غلام رسول نازکی، اندر جیت شرما، غلام رسول آزاد، خموش سرحدی، عبدالرحمان کمار، جگن ناتھ آزاد، میر طاؤس، ثنااللہ عاجز، تنہا انصاری، طالب ایمن آبادی، اکبر ہاشمی، سائف کھوروی، حبیب کامران، شوریدہ کاشمیری، گرداری لعل برق، مہندر رینہ، بشارت سلیم، حکیم جلال الدین، قیصر قلندر، شہزادی کلثوم، اکبر جے پوری، شیو لال رینہ، حامدی کاشمیری، ہر بھگوان شاد، مرغوب بانہالی، گیلانی فرحت، بال کرشن ساگر، محمد حسن محمود، قاضی غلام محمد، حکیم منظور، راج کمار ابرول، شہباز راجوروی، یوسف ریشی، سجود سیلانی ، صادق علی اکبر، نشاط کشتواڑی، غلام جیلانی وغیرہ

وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ان میں سے بعض حضرات ابھی بقیدِ حیات ہیں جو ریاست کے شعری سرمائے کو اپنی تخلیقات سے سرشار و شاداب اور گراں بار کر رہے ہیں۔

تحقیق وتنقید:

کشمیر میں اردو تنقید کے لئے راہیں مہاراجہ رنبیر سنگھ کے زمانے میں کھلتی ہیں۔پروفیسر ظہور الدین لکھتے ہیں:

’’ریاست میں اردو تحقیق کی باقاعدہ روایت مہاراجہ رنبیر سنگھ کی قائم کردہ انجمن ’بدیابلاس سبھا‘ سے ہوتا ہے۔‘‘ ۲۵؎

دیکھا جائے تو حقیقی معنوں میں عبدالاحد آزاد جو کشمیر کے نابغہ اردو شناس تھے‘ سے اردو تحقیق وتنقید کی ابتداء ہوتی ہے‘ جب وہ ۱۹۳۵ء میں ’’حیات مہجور‘‘ کے عنوان سے ایک مقالہ لکھنے کی تیاری میں جٹ جاتے ہیں۔ذوقِ جستجو نے ایسا کمال دکھایا کہ وہ مواد کثرت سے جمع کر گئے اور انہوں نے اس سے اپنی ناقدانہ بصیرت سے ایک ضخیم مسودہ تیار کیا ہے‘ جو اب ہمارے پاس تین جلدوں کی صورت میں ’’کشمیری زبان اور شاعری‘‘ کے عنوان سے ہے۔

ریاستی تحقیق وتنقید کے ابتدائی دور میں ہمیں ایک اور نام پنڈت نندلال کول طالب کا ملتا ہے۔انہوں نے اپنی عالمانہ بصیرت سے ’جوہر آئینہ‘‘ کے نام سے تنقیدی مجموعہ پیش کیا۔طالب نے غالبیات کے سلسلے میں پرمغز مقالے تحریر کئے ہیں۔اس کے علاوہ اس دور میں

غلام حیدر چستی، ڈاکٹر سدھیشو رور ما کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

ریاست میں اردو تحقیق وتنقید کی روایت کو فروغ دینے میں ریڈیو کشمیر جموں اور ریڈیو کشمیر سرینگر کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ان دو اداروں میں بے شمار تحقیقی وتنقیدی، سیاسی وسماجی موضوعات پر ٹاکس لکھوا کر نشر کی گئیں اور اس طرح سے تحقیقی وتنقیدی مزاج کو خاص و عام تک پہنچانے میں نہ صرف مدد ملی، بلکہ شائقینِ ادب کو آزادانہ طور پر لکھنے کی تحریک بھی ملی۔

ریاست میں تحقیق وتنقید کے باب میں کشمیر یونیورسٹی اور جموں یونیورسٹی کے اردو شعبوں نے گراں خدمات انجام دیں۔ ان اداروں سے وابستہ اہل علم ودانش نے اپنی تحقیقی وتنقیدی بصیرت سے نہ صرف ریاست کے تحقیقی، تنقیدی و ادبی سرمائے، بلکہ پورے اردو ادب کو گراں بار کیا۔ ان میں پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر محی الدین قادری زور، پروفیسر شکیل الرحمان اور اگلے دور میں پروفیسر حامدی کاشمیری کا نام سرفہرست ہے۔ انہوں نے اپنی تحقیق وتنقید کو اکتشافی اساس پر استوار کیا۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر اکبر حیدری، ڈاکٹر اسداللہ کامل، ڈاکٹر زماں آزردہ، ڈاکٹر قدوس جاوید، ڈاکٹر نذیر احمد ملک، ڈاکٹر مرغوب بانہالی، ڈاکٹر مجید مضمر، ڈاکٹر جوہر قدوسی، ڈاکٹر محمد امین اندرابی، ڈاکٹر بشیر احمد نحوی، اور جموں سے ڈاکٹر ظہور الدین، ڈاکٹر خورشید حمرا صدیقی، ڈاکٹر نصرت چودھری، ڈاکٹر شہاب عنایت ملک، ڈاکٹر تمہینہ اختر، ڈاکٹر ریاض احمد، ڈکٹر مشتاق احمد وانی وغیرہ پیش پیش ہیں۔

فکشن:

ریاست میں فکشن کے آغاز کا سہرا مرحوم محمد الدین فوق کے سر جاتا ہے' جنہوں نے تاریخی' نیم تاریخی قصے لکھ کر اس کا آغاز کیا۔ ۱۹۲۷ء میں ہمیں ایسی ہی ایک کوشش چرغ حسن حسرت کے یہاں ملتی ہے۔ان کی کہانیوں کا مجموعہ' کیلے کا چھلکا' منظر عام پر آیا۔ باوجود اس کے حقیقی معنوں میں اس صنف کا باقاعدہ آغاز پریم ناتھ پردیسی کے ہاتھوں ہوا۔ان کی ابتدائی کہانیاں جموں سے شائع ہوئیں' جو نہایت ہی چھوٹی' دلچسپ اور نصیحت آموز تھیں۔ پردیسی ریاست کے بڑے افسانہ نگار تھے اور انہوں نے اپنے افسانوں میں ریاست کی بھرپور نمائندگی کی۔ابتدا میں پردیسی کے یہاں ٹیگور کی ڈرمائی فضا ملتی ہے' لیکن بعد میں بقول برج پریمی' انگارے کے افسانوں کی اشاعت اور پریم چند کے کفن نے ان کا ذہن مکمل طور سے بدل دیا۔ ۱۹۳۸ء کے بعد پردیسی حقیقت آمیز ادب کی تخلیق میں مصروف ہوئے۔ اس کے بعد افسانوی ادب میں دوسرا بڑا نام پریم ناتھ در کا آتا ہے۔ بقول ڈاکٹر جوہر قدوسی در کے افسانوں میں کشمیری معاشرے کی حقیقی جھلک نظر آتی ہے۔ ان کے دو افسانوی مجموعے' کاغذ کا واسدیو' اور نیلی آنکھیں' افسانوی ادب میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ اس دور میں دوسرے بڑے ناموں میں نرسنگ داس نرگس' گلزار احمد فدا' کشمیری لال ذاکر' جگدیش کنول' ٹھاکر پونچھی' کیف اسرائلی' عبدالعزیز علائی' غلام حیدر' قدرت اللہ شہاب' وشوا ناتھ ورما' نند لال بے غرض' دینا ناتھ وارکو' محمود ہاشمی' حیدر نظامی' کاشی ناتھ' تیرتھ

کاشمیری، رامانند ساگر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد اردو فکشن کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے اور اس میں ایسے باصلاحیت قلمکار آجاتے ہیں، جو فکشن کے جدید تقاضوں سے براہ راست واقف تھے۔ بقول ڈاکٹر جوہر قدوسیؔ، ان کے یہاں اسالیب اور ہیئت کے نئے تجربے بھی ملتے ہیں اور مضامین کی رنگا رنگی بھی۔ ان میں بعض حضرات فکشن کی ایک ہی صنف، افسانہ یا ناول اور بعض دونوں میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ ان میں سوم ناتھ زتشی، علی محمد لون، اختر محی الدین، تیج بہادر بھان، بنسی نردوش، حامدی کاشمیری، پشکر ناتھ، برج پریمی، نور شاہ، مخمور بدخشی، دیپک بدکی، غلام رسول سنتوش، وجیہ احمد اندرابی اور بعد کے زمرے میں شبنم قیوم، رام کمار ابرول کلدیپ رعنا، محمد زماں آزردہ، ریاض پنجابی، ظہور الدین، ڈی کے کنول، عمر مجید، مالک رام، آنند وجے سوری شامل ہیں۔ مجموعی طور اس صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر نصرت چودھری لکھتی ہیں:

ان فکشن نگاروں نے بالعموم ریاست کے تمدنی، معاشرتی اور سیاسی حالات سے متاثر ہو کر فکشن کے نمونے پیش کئے''۔ ۲۶

ڈراما:

ڈراما نگاری میں بھی ریاست کے فنکاروں نے شاندار مظاہرہ کیا ہے۔ خواہ وہ اسٹیج ڈراما ہو یا ریڈیو یائی ڈرامے، ریاستی ادیبوں کے یہاں جاندار، کامیاب اور اچھے ڈراموں کی روایت ملتی ہے۔ ۱۹۴۷ء سے قبل ریاست میں ڈراما نگاری میں جو نام ملتے ہیں،

ان میں محمد عمر نور الٰہی صاحبان سرفہرست ہیں۔ ان کی تصنیف ''ناٹک ساگر'' ڈرامائی ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ جگدیش کنول' نری مدی رائے زادہ' نرسنگھ داس نرگس' بنسی نردوش' اے ایم عزیز وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

آزادی کے بعد محمود ہاشمی' پردیسی' علی محمد لون' حامدی کشمیری' پشکر ناتھ' وینو بھائی' وجے سوری' سجود سیلانی نے اس فن میں نمایاں کارنامے انجام دئے۔ مجموعی طور پر ان سب نے بقول برج پریمی' تجربے کی گہرائی اور مشاہدے کی صداقت کو بروئے کار لاکر کشمیر کی سیاسی' سماجی' فکری اور تہذیبی زندگی کے اہم پہلوؤں کی ترجمانی کی۔

تعلیمی و مذہبی تحریکات:

ریاست میں اردو ادب کی سماجی' تہذیبی' ثقافتی اور ادبی روایات پر کئی تحریکات کے گہرے نقوش ثبت ہوئے۔ انیسوی صدی کے اوآخر میں دہلی میں وہابی تحریک زوروں پر تھی اور یہ تحریک بقول پروفیسر سروری اپنے اصلاحی جوش میں تحریک آزادی کا سا روپ اختیار کرنے لگی۔ اس تحریک سے متعلق ریاست میں بھی کتابیں پہنچتی رہیں۔ اردو زبان و ادب کی ترویج میں اس تحریک نے اپنا رول ادا کیا' اس کے علاوہ ریاست میں عیسائیوں کی مشنری' مرزا غلام احمد قادیانی کی قادیانیت اور سوامی دیانند سرسوتی کی آریہ سماج جیسی تحریکات نے گہرے اثرات چھوڑے' ان اثرات کی عکاسی یہاں کے ادب میں نمایاں طور پر ملتی ہے۔

ریاست کے اندر بھی چند تحریکات ابھر کر سامنے آئیں' جن سے براہ راست اردو

ادب فیضیاب ہوا۔ ان میں انجمن نصرت الاسلام، انجمن شرعی شیعان، انجمن معین الاسلام، انجمن تبلیغ الاسلام، جمعیت ہمدانیہ، جماعت اسلامی، جمعیت اہلحدیث، انجمن تحفظ الاسلام، انجمن اتحاد الاسلام، جمعیت محبان اولیا اور آل کشمیر شیعہ ایسوسی ایشن قابلِ ذکر ہیں۔

علاوہ ازیں ریاست میں اردو زبان و ادب کا ذوق بڑھانے میں محرم کی کربلائی مجالس کا بھی خاص رول رہا ہے۔ بقول پروفیسر عبدالقادر سروری یہ مجالس جموں و کشمیر میں بڑے اہتمام اور سلیقے کے ساتھ منعقد کی جاتی تھیں۔ ان میں مرثیہ پڑھنے اور سوز خوانی کے لئے خاص طور پر لکھنو سے شاعر اور ذاکر مدعو کئے جاتے تھے اور محرم کے دس دن تک جاری رہنے والی ان مجالس کا جو اثر لوگوں پر پڑا، وہ مذہبی کم اور شعری و ادبی زیادہ تھا۔

ادبی انجمنیں:

ریاست میں ان ادبی انجمنوں کی خدمات بھی قابل ستائش ہیں، جن سے یہاں کے تخلیق کاروں کے لیے اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں پلیٹ فارم کی فراہمی ہوئی۔ ایسی انجمنوں میں ''بزم سخن'' نام کی انجمن سرفہرست ہے۔ بقول ڈاکٹر جوہر قدوسی یہ انجمن ۱۹۰۹ء میں جموں میں قائم ہوئی اور اس کے سرکردہ اراکین میں شیخ غلام حیدر چستی، عبدالحکیم اور مرزا مبارک قابل ذکر ہیں۔ اس انجمن کا اصل کارنامہ بقول سروری وہ سالانہ مشاعرے ہیں، جن میں اردو کے سربرآوردہ شعراء شرکت کرتے تھے۔ بعد میں اس انجمن کا نام ''بزم جموں و کشمیر'' رکھا گیا، جس کے تحت ۱۹۳۹ء کے مشاعرے میں سر تیج بہادر سپرو نے شرکت

کی۔اس سے ریاست کے نوجوان قلمکاروں کو ایک نئی راہ ملی۔ ۱۹۱۴ء میں اسی طرح کی ایک بزم ''بزم مشاعرہ'' جموں میں قائم کی گئی جس کا مقصد بھی شعروشاعری کا فروغ تھا۔اس بزم کے سرکردہ اراکین میں شیخ غلام نقشبند' سردار وزیر محمد خاں' غلام قادر زور' میر خورشید احمد' غلام علی حسرت' غلام حیدر خاں اور امرناتھ شاہد وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

پردیسی کی کوششوں ں سے کشمیر میں حلقہ ارباب ذوق قائم ہوا اور ساتھ ہی ساتھ رامانند ساگر نے ''انجمن ترقی پسند مصنفین'' کی شاخ قائم کر لی۔ ۱۹۴۴ء کے آس پاس انجمن ترقی اردو کی تشکیل و تنظیم ہوئی۔اس انجمن کی ابتدا میں بقول ڈاکٹر جوہر قدوسی اقبالیات پر تقاریر کا ایک طویل سلسلہ چل پڑا۔اس کے جلسوں میں ڈاکٹر تاراچند' ڈاکٹر یوسف حسین خان' ڈاکٹر عبدل الحکیم' اور ڈاکٹر ہادی حسن جیسے اکابریں کی شرکت شامل رہی۔ ۱۹۴۷ء میں ''کلچرل فرنٹ'' نام کی تنظیم قائم کی گئی جو بعد میں آل اسٹیٹ کلچرل کانفرس میں تبدیل ہوئی۔''کونگ پوش'' اور'' آزاد'' کے نام کے دو رسالے اس انجمن کے زیر اہتمام شائع ہوتے رہے۔آزادی کے بعد درجنوں انجمنیں قائم ہوئیں' جن میں انجمن ادب' ادبی کنج' بزم ادب جموں' حلقہ علم وادب' بزم یادگار اقبال'لٹریری فورم' انجمن ارباب ذوق' بزم اقبال' کشمیر پروگرسیو رائٹرس ایسوسی اشین جموں' آل انڈیا اردو ہندی سنگم' کشمیر کلچرل لیگ' ادارہ علم وآگہی' انجمن فروغ اردو جموں' ینگ رائٹرس ایسوایسیشن اور شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالروں کی قائم کردہ ادبی انجمن ''احتساب'' وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔

ریاست نے اردو زبان وادب کے پھیلاؤ، اس کی اشاعت اور توسیع اور خدمت

گزاری میں جو کام کیا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں کے لوگوں کو اس زبان کے ساتھ بے حدمحبت ہے۔ لسانی اعتبار سے ریاست کئی بولیوں میں بٹی ہوئی ہے مثلاً کشمیری، ڈوگری، لداخی، گوجری، پہاڑی، بلتی، شینا، بھدرواہی وغیرہ۔لیکن سرکاری اور تعلیمی زبان کی حیثیت سے اردو ریاست کے تینوں خطوں کے درمیان رابطے کی زبان کے طور پر کام کر رہی ہے۔ اس طرح تینوں خطوں کے باشندوں نے اس کو ایک تہذیبی زبان کی حیثیت سے قبول کیا ہے اور اسی زبان کے ذریعے ہندوستان کے ساتھ تہذیبی رشتے قائم رکھئے ہوئے ہیں۔ڈاکٹر نذیر احمد ملک اس حوالے سے رقمطراز ہیں:

> ''ریاست جموں وکشمیر ہندوستان کی واحد راست ہے جہاں اردو کو سرکاری اور تعلیمی زبان کا درجہ حاصل ہے۔ دکن کی طرح یہ ریاست اور خاص کر کشمیر لسانیاتی اعتبار سے اردو کے لئے ایک اجنبی علاقہ ہے لیکن اس زبان کی قوت کی داد دیجئے کہ یہاں کی زبان میں بھی اس نے بہت جلد اپنی جڑیں دور دور تک پھیلائی اور یہاں کے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنالیا'' ۲۷۔

کشمیر میں صوفیوں اور ان کے مریدوں کو کافی اہمیت حاصل تھی۔ معاشرتی، مذہبی اور ثقافتی زندگی پر عالموں، پیروں اور صوفیوں کا زیادہ اثر تھا۔ بقول ڈاکٹر نذیر احمد ملک، اردو کی طرف یہاں کے لوگوں کی زیادہ سے زیادہ دلچسپی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس میں مذہبی داستانوں اور شعری ادب کا اچھا خاصا سرمایا تھا۔ بقول بنسی نردوش نہ جانے وہ کون سا جادو

ہے جو صوفیوں اور سنتوں کو ہمیشہ کھینچ کر کشمیر بلاتا رہا ہے وتستا کی بے قرار لہریں ہی بتا سکتی ہیں کہ انہوں نے کتنے ایسے بزرگ لوگوں کے پاؤں دھو کر پیئے ہیں۔

کشمیری تہذیب وتمدن میں تحلیل وترکیب کا عمل بڑی دیر سے جاری ہے۔اسی کے فیض و برکت سے کشمیری تہذیب شگفتہ جبین بھی ہے اور کشادہ دل بھی، مذہبی رواداری اور افہام وتفہیم کا عمل اس ریاست کی تہذیب کا خاصا ہے چنانچہ بدھ مت' شیومت' اسلامی ثقافت یا دوسرے ایسے مختلف العقائد فرقوں کی آزادیٔ رائے تاریخ کے سینے میں صبر وتحمل کی یادیں تازہ کرتی ہے۔حامدی کاشمیری لکھتے ہیں:

> ''یہ خطہ ہمیشہ سے روحانی اور مذہبی تصورات کو فروغ دینے میں پیش پیش رہا ہے۔ اس کی مٹی میں خدا پرستی، انکساری، حلیمی، خودشناسی اور مروت ہے' چنانچہ یہ ہر زمانے میں مذہبی تعلیمات کا مرکز رہا ہے''۔۲۸

کشمیر میں تہذیبوں کے اتصال اور تحلیل وترکیب کا عمل ملک کے دوسرے حصوں سے کچھ الگ رہا ہے۔ یہ ریاست کئی اعتبار سے ملک کی دوسری ریاستوں سے منفرد ہے۔ چنانچہ یہاں کی مذہبی رسومات، زبان، لباس، خوراک، طرز تعمیر، شادی بیاہ کے رسوم، میلے ٹھیلے، اور تمدنی سرگرمیاں مثلاً لوک گیت، ناچ ونغمہ وغیرہ مختلف ہیں۔کشمیر کی تہذیبی زندگی کی خوشنما عمارت انسانی قدروں کی روشن تصورات پر استوار ہوئی ہے۔ ہمدردی' محبت' مہمان نوازی ،توکل، تحمل اور مذہبی رواداری کی قدریں کشمیری نسل کی خون میں تحلیل ہوگئی ہیں' خاص کر

مذہبی رواداری اس کی شناخت بن گئی ہے۔

بدیسی حکمرانوں کے تسلط میں آنے کے بعد کشمیری قوم میں شعوری طور پر برائیاں پیدا ہوگئی چنانچہ مغل دور، افغان دور، سکھ دور، اور ڈوگرہ حکمرانوں کے دور میں کشمیری قوم کی ذہنیت مفلوج سی ہوکر رہ گئی۔ڈاکٹر حامدی کاشمیری اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''کشمیر کے لوگ قدیم زمانے سے مختلف حملہ آورں اور مطلق العنان بادشاہوں اور راجاؤں کے ظلم وتشدد، غلامی، جہالت، اور پسماندگی کا شکار رہنے کے باوجود اپنی فطری ذہانت، قابلیت، ہوشمندی، اور زیرکی سے نہ صرف اس ملک کو، بلکہ بیروں ممالک کو بھی گہرے طور پر متاثر کرتے رہے ہیں۔''۲۹۔

کشمیریوں کے مزاج میں غلامی در غلامی کے درد کا اثر اب تک تندی، برہمی، یا غصیلے پن کی شکل میں موجود ہے اور اکثر لگتا ہے کہ کشمیریوں میں برداشت کا مادہ بہت کم ہے اور وہ بات بات پر لڑ پڑنے یا رونے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔لیکن ان قباحتوں کے باوجود، بقول ڈاکٹر مرغوب بانہالیؔ ذہین اور غیرت مند کشمیریوں نے اپنے دامنِ اخلاق کو تنزل کی آلائشوں سے اسی طرح بچائے رکھا ہے جس طرح یہاں جھیل ڈل کے کنول مچلتی موجوں کی لپیٹ میں ہوکر بھی اپنے دامن کو تر ہونے سے بچائے رکھتے ہیں۔

کشمیری تشخص کی پہچان ان کی جمالیاتی آ گہی بھی ہے چنانچہ اہل کشمیر جدید میکانک شہروں کے شور آلودہ، دھواں آلودہ فضا سے دور، فطرت کے بنائے ہوئے چمن میں سانس

لے رہے ہیں، ایک ایسی فضا جو سرسبز اور برف سے ڈھکے پہاڑوں کی آغوش' بدلتے رنگوں، نغمہ آفرینیوں، شادابیوں سے قریب ہے۔ اہل کشمیر کے اس نکھرے ہوئے جمالیاتی حس کا اندازہ یہاں کے فنون لطیفہ سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔ بقول حامدیؔ کاشمیری فطرت سے قریب وموانست نے یہاں کے لوگوں میں خلوت پسندی، ذات شناسی، کم گوئی، زندگی کی فنا پرستی اور تحمل پسندی کو فروغ دیا ہے اور یہ وہ اقدار ہیں جو وادی کشمیر کی سرزمین سے پھوٹتی ہیں اور پوری دنیا کو منور کرنے کی قوت رکھتی ہیں۔

بلاشبہ اردو زبان وادب کے لئے ریاست میں ایک سازگار ماحول ہے' جس میں نئی نسل کے لکھنے والے پورے اعتماد اور قوت کے ساتھ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کر رہے ہیں اور یوں اپنی سماجی، سیاسی، تہذیبی اور ادبی زندگی کے گوناگوں تجربات کو پیش کرتے ہیں اور یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ کشمیر نے اردو زبان وادب کے ایک اہم اور مستند مرکز کی حیثیت قائم کر لی ہے۔

کشمیر کے تہذیبی اثاثے کی ترویج اور توسیع کے لئے اردو نے جہاں ایک اہم اور موثر ذریعے کا کام کیا ہے، وہیں غیر کشمیریوں کو کشمیر کی تہذیبی وراثت کا علم بہم پہنچانے میں بھی اردو زبان نے ترسیل کے ایک اہم ہتھیار کا فریضہ انجام دیا ہے۔ قدیم شعرا کے ساتھ ساتھ جدید شعراء اور ادبا کے کارناموں سے باہر کی دنیا کو جانکاری فراہم کرنے میں اردو کی اہمیت مسلمہ رہی ہے۔ گزشتہ برسوں کے دوران ریاست جموں وکشمیر میں جو تہذیبی اور تمدنی احیاء کا سلسلہ جاری ہے اس میں اردو زبان اظہار کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ اس تمام ترعمل کی ترجمان بھی

رہی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ تعمیر خصوصی شمارہ (انتخاب نمبر) اگست ۱۹۹۹ء۔ص۔۔۱۳۸
۲۔ قومی زبان کا مسلہ از عابد حسین۔۔ص ۱۵
۳۔ کشمیر میں اردو زبان وادب کی ترویج میں صحافت کا رول (۱۹۴۷ء کے بعد) از جوہر قدوسی۔ص ۶
۴۔ کشمیر میں اردو۔از۔ پروفیسر عبدالقادر سروری ص ۸
۵۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص ۳۱
۶۔ بحوالہ شیرازہ جموں کشمیر لداخ قدیم تذکروں اور سفر ناموں کی روشنی میں جلد ۷ ص ۷ ۲۳۔۳۸
۷۔ کشمیر میں اردو زبان وادب کی ترویج میں صحافت کا رول (۱۹۴۷ء کے بعد) از ڈاکٹر جوہر قدوسی۔ص ۱۰
۸۔ اردو غزل کی ثقافتی اساس از ڈاکٹر شبینہ پروین۔۔۔ص ۱۵۰
۹۔ کشمیر میں اردو زبان وادب کی ترویج میں صحافت کا رول (۱۹۴۷ء کے بعد) از ڈاکٹر جوہر قدوسی۔ص ۱۷۔۱۸
۱۰۔ کشمیر میں اردو۔از۔ پروفیسر عبدالقادر سروری جلد اول ص ۸۷
۱۱۔ کشمیر میں اردو زبان وادب کی ترویج میں صحافت کا رول (۱۹۴۷ء کے بعد) از ڈاکٹر جوہر قدوسی۔ص ۱۸۱۷
۱۲۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص ۲۵
۱۳۔ کشمیر میں اردو۔از۔ پروفیسر عبدالقادر سروری جلد دوم ص ۱۳۸
۱۴۔ کشمیر میں اردو زبان وادب کی ترویج میں صحافت کا رول (۱۹۴۷ء کے بعد) از ڈاکٹر جوہر قدوسی۔ص ۳۰
۱۵۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص ۳۱
۱۶۔ جموں کشمیر کی شعری محفلیں از حبیب کیفوی صحیفہ لاہور ۱۹۶۶ء ص ۱
۱۷۔ کشمیر میں اردو۔از۔ پروفیسر عبدالقادر سروری جلد دوم ص ۲۴۴۔۔۴۵۔۔۴۶
۱۸۔ بحوالہ جشنِ زرین نمبر باز یافت نمبر۔۔۔ص ۱۲۱
۱۹۔ بحوالہ باز یافت گولڈن جبلی نمبر ۱۹۸۴ء ص ۱۴۰
۲۰۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً
۲۱۔ بحوالہ شیرازہ۔۔اردو ادب کے پچاس سال جلد ۳۵ شمارہ ۸۔۔۶ ص ۱۶۶

۲۲ ؎: کشمیر میں اردو زبان وادب کی ترویج میں صحافت کا رول (۱۹۴۷ء کے بعد) از جوہر قدوسیؔ۔ص ۳۸
۲۳ ؎: بحوالہ شیرازہ۔۔اردو ادب کے پچاس سال جلد ۳۵ شمارہ ۸۔۔۶ ص ۱۶۶
۲۴ ؎: بحوالہ ہمارا ادب (شیرازہ) ۔۔۔انتخاب نمبر ۱۹۷۹ء۔۔۔۸۷ ص ۱۰۵
۲۵ ؎: بحوالہ بازیافت جشن زرین نمبر۔۔۔۲۰۰۷ء ص ۱۰۰
۲۶ ؎: اضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً
۲۷ ؎: بحوالہ تعمیر خصوصی شمارہ ۱۹۹۹ء ص ۱۳۲
۲۸ ؎: کشمیر میں اردو ادب از حامدی کاشمیری ص ۵۴
۲۹ ؎: ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً ص ۵۲

باب دوم

بشیر احمد نحوی کے سوانحی حالات و شخصیت

یہ ایک تاریخی اور مسلمہ حقیقت ہے کہ جنوبی کشمیر کا قصبہ بجبہاڑہ اپنی آغوش میں صدیوں سے تہذیب وتمدن، شعروادب اور دینی علوم سے وابستہ متعدد علماء، دانشوروں اور شاعروں کو جنم دے چکا ہے ۔تاریخی شواہد سے یہ بات واضح ہے کہ سینکڑوں سال پہلے بجبہاڑہ ہندو اور بدھ مذاہب کا مرکز رہ چکا ہے اور یہاں چین، تبت، لداخ، اور وسطی ایشیا سے علم ودانش کے متلاشی پیدل سفر طے کر کے اس سرچشمہ علم وآگہی سے فیض یاب ہوکر واپس لوٹتے تھے۔علم وادب کے ساتھ اس قصبے کا یہ تعلق برابر قائم رہا، چنانچہ کشمیر میں اسلام کے ورودِ مسعود کے ساتھ بجبہاڑہ اسلامی علوم کا اہم گہوارہ بنا رہا اور یہاں ساڑھے تین سو سال

پہلے ابو الفقراء حضرت بابا نصیب الدین غازیؒ کی تشریف آوری اور پھر ان کے یہاں پر ابدی مسکن اختیار کرنے کے نتیجے میں بجبہاڑہ نے علمی اور دینی اعتبار سے وادی کے اکثر قصبہ جات پر فوقیت حاصل کی ۔ حضرت غازیؒ کے چند خلفاء بھی یہاں مدفون ہیں اور ان کی اولاد و اسلاف میں وقتاً فوقتاً جید علما و فضلاء جنم لیتے رہے ۔ مولانا سید محمد اشرف اندرابی لکھتے ہیں :

''قصبہ بجبہاڑہ کو وادی کشمیر میں اس لحاظ سے ایک امتیازی مقام حاصل ہے کہ قدیم زمانہ سے یہ قصبہ علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے ۔ دور اسلام میں بھی اس کے باکمال فرزندوں نے علم و فن اور شعر و ادب کی روایت کو برقرار رکھا اور اسلامی علوم کی نشر و اشاعت میں شاندار کارنامے انجام دئے''[۱]

گذشتہ سوڈیڑھ سو سال کی تاریخ پر نظر دوڑا کر ہمیں درجنوں عالم فاضل، شاعر، فقیہہ، مفتی، حافظ اور قاری اپنے اپنے شعبوں میں زبردست دستگاہ رکھتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ بابا نصیب الدین غازیؒ کے صحن میں ایک اندازے کے مطابق تیس سے زائد حفاظ کرام مدفون ہیں اور صحن کے اندر اور باہر درجنوں پیرانِ طریقت اور داعیان رشد و ہدایت آرام فرما ہیں ۔ ایک صدی کے عرصے میں ہمیں یہ چند شخصیتیں افق علم و ادب پر جلوہ افگن اور راہ طریقت و طہارت میں نمایاں صفات کی حامل نظر آتی ہیں ۔ یہ سبھی شخصیات دنیائے فانی سے رحلت کر چکی ہیں ۔

پیر عبدالقدوس شاہ، خضر بابا مقبل، محی الدین مہدی، قمر الدین خاکی، عبدالاحد ناظم،

غلام مصطفیٰ مصفاؔ، غلام مصطفیٰ زیرک ،مفتی محمد عبداللہ، مفتی محمد مقبول ،مفتی احمد اللہ، شمس الدین مقبل ،نورالدین ناظمی ،منشی خیر اللہ، پیر غلام مصطفیٰ شاہ ، غلام حسن خاکی ، پیر حبیب اللہ ہمدانی ، منشی غلام نبی ڈاراور فی الوقت قصبہ بجبہاڑہ علم وادب سے گہرے ربط وتعلق رکھنے والی چند ممتاز شخصیتوں سے متمول اور مالا مال ہے۔ ان میں پروفیسر غلام محمد شاد، غلام حسن نحوی ، پروفیسر ڈاکٹر قاضی احمد اللہ‘ پروفیسر عبدالغنی شاہ، سید رسول پوپنر ،مولانا غلام رسول امام، جناب مفتی غلام نبی ،محمد یوسف زیرک ، جناب غلام مصطفیٰ رفیقی‘ مفتی ضیاالحق ناظمی ، غلام نبی شاہ مخمور‘ ماسٹر رفیع الدین بودا‘ غلام نبی زرگر‘ عبدالعزیز شاہ‘ سیف الدین پنڈت‘ ماسٹر موہن لال آش‘ ماسٹر محمد شفیع شاہ‘ غلام حسن ڈار ممتاز حیثیت کی حامل شخصیات ہیں۔

اسی قصبہ بجبہاڑہ کی زیارت گاہِ بابا نصیب الدین غازیؒ کے عقب میں خانوادہ خواجہ نحوی تین سو سال سے سکونت پذیر ہے۔اس گھرانے کے ساتھ دینی ،علمی اصلاحی اور ادبی تاریخ وابستہ ہے۔ رمانہ کے نشیب وفراز نے اگر چہ درمیان میں راہیں مسدود بھی کر دیں۔لیکن بجبہاڑ کی مردم خیز بستی کے زیرک‘ ذکی الحس شخصیتوں نے ہر دور میں اپنی ہمہ جہت فنی‘ ادبی‘ علمی وعملی سرگرمیوں کا مظاہرہ کر کے اپنی عبقریت کا سکہ جمایا ہے۔

اسی قصّبہ بجبہاڑہ میں سکونت پزیر نحویوں کے گھرانے میں بشیر احمد نحوی ۱۶ فروری ۱۹۵۵ءکو پیدا ہوئے۔اس حوالے سے ڈاکٹر بدرالدین بٹ رقمطراز ہیں:

’’حافظِ کلام اقبال کے لقب سے مشہور ،اقبال انسٹی ٹیوٹ کے موجودہ ڈائریکٹر پروفیسر بشیر احمد نحوی (پ:۱۹۵۵ئ) جنوبی

کشمیر کے ضلع اسلام آباد کے تاریخی اور مردم خیز قصبے بجبہاڑہ کے
معروف ومشہور علمی خانوادے کے چشم و چراغ ہیں۔''۲؎

مفتی ضیاء الحق ناظمی نحوی خاندان کے حوالے سے مرحوم غلام حسن نحوی (والد بشیر احمد نحوی) کی وفات پر ایک تعزیتی پیغام میں ان کے خاندان پر روشنی ڈالتے ہوئے یوں لکھتے ہیں:

''اس قصبہ میں نحوی خاندان کو علوم شرقیہ اسلامیہ کے تعلق سے
ایک منفرد اہمیت ،خصوصیت اور انفرادیت حاصل ہے۔علوم
شرقیہ اسلامیہ میں صرف ونحو' تفسیر،علم حدیث،منطق ، فقہ،علم
الکلام وغیرہ اس خانوادہ میں دوسرے علمی خاندانوں اور
خانوادوں کی طرح نسلاً بعد نسلاً منتقل ہوتا آیا ہے''۳؎

بشیر احمد نحوی کے والد بزرگوار' غلام حسن نحوی کا شمار وادی کے جید علمائے دین میں ہوتا تھا۔ان کو عربی' فارسی' اردو اور کشمیری زبانوں پر عبور کامل حاصل تھا۔مرحوم نحوی نے درس وتدریس کو وظیفہ حیات بنا کر نصف صدی سے زیادہ عرصے تک تبلیغ دین سے عوام کو مستفید کیا۔سید محمد مجید اندرابی ان کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''مولانا غلام حسن نحوی جہاں ایک اعلیٰ پایہ کے مدرس اور مبلغ تھے
وہاں شاعری بھی ان کی طبیعت کا اہم حصہ تھی'' ۴؎

مرحوم غلام حسن نحوی وسیع المطالعہ تھے۔وہ مختلف اسلامی تحریکوں کے لٹریچر پر اچھی نظر

رکھتے تھے۔تفسیر جلالین، تفسیر کشاف، تفسیر ابن کثیر اور تدبر قرآن (امین احسن اصلاحی) سے کافی متاثر تھے۔مولانا سید ابوالاعلی مودودی کے تفہیم القرآن کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ سمجھتے تھے۔علمائے دیو بند میں مولانا قاسم نانوتوی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا محمود الحسن، مولانا انور شاہ کاشمیری، اور قاری محمد طیب کو عربی علوم اور احادیث پر ان کی گہری دسترس پر داد تحسین دیتے تھے۔علمائے بریلوی میں مولانا احمد رضا خان بریلوی کے عشق رسول اکرمؐ کے بے پناہ مداح تھے۔حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے تجدیدی کارناموں کا اکثر تذکرہ کرتے تھے۔

مرحوم غلام حسن نحوی کے والد بزرگوار یعنی بشیر احمد نحوی کے دادا مرحوم غلام مصطفیٰ مصفا ایک معتبر عالم دین ہونے کے علاوہ ایک قادر الکلام شاعر بھی تھے۔چالیس ہزار ابیات پر مشتمل ان کی مثنوی ''تاریخ الانبیائؑ'' تین جلدوں میں چھپ چکی ہے۔ان کے والد خواجہ محمد بھی اپنے زمانے میں وعظ وتبلیغ کے علاوہ یونانی طبابت میں کامل مہارت رکھتے تھے۔اس طرح یہ سلسلہ چلتے چلتے خواجہ محمد سے ارشد صاحب تک اور ان کے والد حمزہ صاحب تک پہنچتا ہے' جو خود سرینگر کے رہنے والے تھے اور قصبہ بجبہاڑہ میں بطور خانہ داماد سکونت پذیر ہوئے تھے۔بشیر احمد نحوی خود اپنے حسب ونسب کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

''آپ کے (یعنی دادا کے) والد بزرگوار کا اسم گرامی خواجہ محمد تھا جو وعظ وتبلیغ کے علاوہ یونانی طبابت میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ آپ قطب وقت جناب قدوس صاحب کے فرزند ارجمند

تھے۔قدوس صاحب حافظ قرآن اور عالم باعمل ہونے کے ساتھ انتہائی خلوت پسند تھے۔آپ خانقاہ فیض پناہ بابا نصیب الدین غازی میں امامت کے فرائض انجام دینے کے علاوہ ہر ماہ قرآن پاک کا ایک نسخہ تحریر فرماتے تھے۔آج تک قصبہ کے دینی حلقوں میں آپ کے زہد وتقویٰ کے واقعات زبان زد خاص وعام ہیں۔ آپ کے والد محترم ارشد صاحب اپنے عہد کے سر برآوردہ مدرس قرآن مانے جاتے تھے۔آپ کی روحانی طاقت اور باطنی صلاحیت کا یہ عالم تھا کہ میاں گل محمد کنگال جو اس وقت کے عارف باللہ اور فتح کدل سرینگر میں مسند ارشاد پر فائز تھے، کے انتقال کے وقت وصیت کے مطابق ان کی تجہیز وتکفین کے لئے ارشد صاحب ہی منتخب قرار دئے تھے کیونکہ ارشد صاحب کے والد بزرگوار حمزہ صاحب خود سرینگر کے رہنے والے تھے اور قصبہ بجبہاڑہ میں بطور خانہ داماد سکونت پذیر ہوئے تھے اور اپنے زمانے میں بلند پایہ شخصیت کے مالک تھے۔'' ۵۔

غلام حسن نحوی کا انتقال ۲۰۱۲ء میں ہوا۔ان کا مدفن بابا نصیب الدین غازی کے متصل تین سو سال پرانی 'جامع مسجد' کے داہنے صحن میں ہے۔

بشیر احمد نحوی اسی علمی وادبی خاندان کے چشم وچراغ ہیں۔روایت کے مطابق ابتدائی

تعلیم اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی۔ ثانوی درجے کا امتحان مقامی اسکول سے پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ ڈگری کالج اسلام آباد (اننت ناگ) میں ۱۹۷۳ء میں داخلہ لیا۔ پروفیسر شوریدہ کاشمیری لکھتے ہیں:

''نحوی نے گورنمنٹ ڈگری کالج اسلام آباد سے' جہاں میں اردو پڑھاتا تھا' ۱۹۷۵ء میں بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔''۶؎

بشیر احمد نحوی نے دوران کالج ہی اپنی ذہانت اور سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کیا، چنانچہ کالج میگزین کی ادارت کے ساتھ ساتھ ان کے بعض مضامین روزنامہ ''آفتاب'' (جس کے مدیر مرحوم خواجہ ثناءاللہ بٹ تھے) میں چھپتے تھے۔ ڈاکٹر سید محمد فضل اللہ اپنے مضمون میں بشیر احمد نحوی کے حوالے سے بڑے ہی معتبر انداز میں لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر صاحب نے ہوش سنبھالتے ہی اعلیٰ خاندانی وقار کا ورثہ لیا ہے اور عالم شباب کی دہلیز پر قدم رکھتے ہوئے ضبط نفس اور پاک دامنی کو اختیار کیا ہے۔ اب دانشگاہ علم وعرفان کے زینے پر آ کر ڈاکٹر صاحب نے حسان بن ثابت کی قدم بوسی ومشایعت نقش قدم کی۔ انہوں نے جو کچھ لکھا وہ علم وآگہی اور حق کی طرفداری میں لکھا۔''۷؎

۱۹۷۲ء میں بشیر احمد نحوی نے ڈگری کالج اسلام آباد میں داخلہ لیا۔ جو جنوبی کشمیر کا پہلا تعلیمی ادارہ ہے۔ یہیں پر بشیر احمد نحوی کو اپنی ادبی صلاحیتوں کو ابھارنے کا موقع ملا۔ اس

حوالے سے خود ان کا ایک بیان ملاحظہ ہو:

''مجھے کالج لائف کا پہلا وقعہ یاد آرہا ہے کہ سرمائی تعطیلات شروع ہونے سے پندرہ دن پہلے ۲۹ نومبر ۱۹۷۲ء کو ایک محفل مباحثہ کا انعقاد ہوا۔ مباحثہ کا عنوان تھا، science has done more harm to humanity than good۔ اس مباحثے کی اہم ترین خصوصیت یہ تھی کہ عنوان دس منٹ پہلے کالج کے پرنسپل جناب پیرزادہ علی محمد صاحب نے تجویز کیا، بیس پچیس مقررین نے دھواں دار تقریریں کیں، لیکن خوش نصیبی سے میری تقریر بہترین قرار دی گئی۔ شام کو ریڈیو کشمیر کے کشمیری اور اردو خبروں کے بلیٹن میں میرا ذکر کیا گیا' جس سے میری زبردست حوصلہ افزائی ہوئی، اس دن سے لیکر گریجویشن مکمل ہونے تک کالج کے تمام مباحثوں، مذاکروں اور ادبی سرگرمیوں میں میرا بڑھ چڑھ کر حصہ رہا۔'' ۸؎

اس طرح زمانہ طالب علمی میں بشیر احمد نحوی نہ صرف علمی وادبی مذاکروں اور مباحثوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے بلکہ کالج میگزین کی ادارت بھی بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔ شوریدہ کاشمیری (جو کشمیر کے سرکردہ اور معتبر شاعر گزرے ہیں اور اس وقت اسلام آباد کالج میں اردو پڑھاتے تھے) اپنے مضمون میں بشیر احمد نحوی کی ابتدائی ادبی زندگی

پر روشنی ڈالتے ہوئے یوں لکھتے ہیں:

عزیز القدر بشیر احمد نحوی سرزمین علم وادب قصبہ بجبہاڑہ کے ایک علمی خاندان کے ابھرتے ہوئے نوجوان ہیں ۔نحوی نے گورنمنٹ ڈگری کالج اسلام آباد سے' جہاں میں اردو پڑھاتا تھا۔۱۹۷۵ء میں بی۔اے پاس کیا، طالب علمی کے زمانے میں علمی مناظروں، ادبی تقریروں اور کالج میگزین کی ادارت میں بڑی سرگرمی سے اپنے جوہر دکھائے اور اس طرح اپنے ہم چشموں میں امتیاز حاصل کیا''۔ ۹؎

جان محمد آزاد اپنی کتاب ''جموں کشمیر کے اردو مصنفین'' میں ڈاکٹر بشیر احمد نحوی کے حوالے سے ایک مختصر مضمون میں لکھتے ہیں:

''ادب کا ذوق اسلام آباد کالج کے رسالے میں پروان چڑھا ۔ آپ اس رسالے ''ویری ناگ'' کے ۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۵ء تک ایڈیٹر بھی رہے''۔ ۱۰؎

کالج کے دوران بشیر احمد نحوی کے بعض مضامین اس وقت کے معروف روزنامہ ''آفتاب'' میں چھپتے رہے۔اسی روزنامے میں شائع ہوئے بعض مضامین کو بشیر احمد نحوی نے کتابی صورت دے کر ''محسوسات'' کے عنوان سے شائع کیا۔بشیر احمد نحوی خود اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''محسوسات ،،میرے بچپن کے داخلی اور خارجی تاثرات' بکھرے ہوئے خیالات اور جذبات پر مشتمل چھوٹے بڑے مضامین کا مجموعہ ہے۔محسوسات میں ان مضامین کا انتخاب کیا گیا ہے' جو روزنامہ'' آفتاب'' سرینگر کے لئے وقتاً فوقتاً لکھے گئے تھے۔''اا۔

۱۹۷۵ء میں بشیر احمد نحوی نے بی۔اے کا امتحان پاس کیا اور اعلیٰ تعلیم کے لئے کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی میں داخلہ لیا،لیکن انگریزی ادبیات سے خاطر خواہ دلچسپی نہ تھی اور انہوں نے انگریزی کے سفر کو چھوڑا اور اردو کو اپنا لیا۔شوریدہ کاشمیری لکھتے ہیں:

''کالج سے فارغ ہونے کے بعد یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی میں داخلہ لیا،لیکن انگریزی ادبیات راس نہ آنے کے سبب اردو کی طرف منتقل ہوئے''۔ ۱۲۔

اس طرح انہوں نے ایم۔اے اردو امتیاز کے ساتھ پاس کیا اور اس کے بعد تین سال تک اسلامیہ حنفیہ کالج اسلام آباد میں بحیثیت مدرس کام کرتے رہے۔ڈاکٹر بدرالدین بٹ لکھتے ہیں:

''پوسٹ گریجویشن کے بعد تین سال تک حنفیہ کالج اسلام آباد میں اردو لیکچرر کی حیثیت سے اپنے علم وعرفان سے نوجوانانِ قوم کے اذہان کو منور کرتے رہے'' ۱۳۔

حصول علم کی لذت نے بشیر احمد نحوی کو مدرسی چھوڑنے پر مجبور کیا اور انہوں نے کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ اقبالیات میں ایم۔فل میں داخلہ لیا۔ ایم۔فل مکمل کرنے کے بعد ان کا تقرر دوردرشن میں ہوا۔ شوریدہ کاشمیری لکھتے ہیں :

''بعد ازاں ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے اقبال انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لیا اور پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر کبیر احمد جائسی کی نگرانی میں ایم۔فل کیا۔ اسی دوران سرینگر دوردرشن میں بحیثیت اسسٹنٹ پرڈیوسر منتخب کیئے گئے''۔ ۱۴؎

ڈاکٹر بدرالدین بٹ کا بھی یہی خیال ہے، چنانچہ لکھتے ہیں :

''علم وتحقیق کے ساتھ والہانہ ذوق وشوق کے تحت نحوی صاحب نے اقبال انسٹی ٹیوٹ میں ریسرچ کے لئے داخلہ لیا اور پروفیسر کبیر احمد جائسی کی نگرانی میں 'اقبال اور مسائل تصوف' پر مقالہ لکھ کر ایم۔فل کی ڈگری حاصل کی ۔ ایم ۔فل کے بعد ان کا تقرر سرینگر کے دوردرشن کیندر میں بحیثیت اسسٹنٹ پرڈیوسر ہوا''

۱۵؎

بشیر احمد نحوی نے دوردرشن سرینگر میں کئی سال تک کام کیا اور اپنی علمی لیاقت سے لوہا منوایا۔ اس کے باوجود علم وتحقیق کے ساتھ والہانہ ذوق وشوق اور بالخصوص اقبالیاتی ادب کے ساتھ والہانہ وابستگی وعقیدت کی وجہ سے انہوں نے دوردرشن کی ملازمت کو خیرباد

کہا۔ دوردرشن کی ملازمت کے دوران انہوں نے شعبہ اقبالیات سے پروفیسر آل احمد سرور مرحوم اور پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی مرحوم کی مشترکہ نگرانی میں ’اقبال اور مسائل تصوف، کے موضوع پر ایک بسیط مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ یہاں پر یہ بات کہتا چلوں کہ بشیر احمد نحوی نے اپنے ایم۔فل میں ’’اقبال اور مسائل تصوف‘‘ کے موضوع پر دو باب لکھ کر ایم۔فل کی ڈگری حاصل کی تھی اور بعد میں انہوں نے اسی موضوع کو طول دیتے ہوئے پی۔ ایچ۔ڈی میں مزید توسیع و اضافت کے ساتھ گیارہ ابواب پر مشتمل مقالہ داخل کیا۔شوریدہ کاشمیری اپنے مضمون ’’شاگرد استاد کی نظر میں‘‘ میں لکھتے ہیں:

> ’’ملازمت کے ساتھ ساتھ شوق تحقیق جاری رہا اور اس طرح دوردرشن سے ایک سال کی چھٹی پر جا کر یونیورسٹی میں پی۔ ایچ۔ ڈی مکمل کرنے کے لئے داخلہ لیا اور یہ تگ دو جون ۱۹۸۸ء میں پوری ہوگئی، جب انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے نوازا گیا‘‘
>
> ۱۶ے

دوسری طرف ان کی تحریک پر ریاست میں ۱۹۸۶ء میں اقبال اکیڈیمی کا قیام عمل میں لایا گیا، جس کے بانی سیکرٹری بشیر احمد نحوی ہی منتخب ہوئے۔اس اکیڈیمی نے اقبالیاتی مشن پر ۹ نومبر ۱۹۸۶ء سے کام کا آغاز کیا۔ اس کے تحت مختلف مقامات پر ۱۳ سے زائد ادبی تقاریب منعقد کی گئیں۔ ڈاکٹر بدرالدین بٹ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ’’جموں وکشمیر میں ۱۹۸۶ء میں اقبال اکیڈیمی کے نام سے جو

تنظیم بنی' اس کے روح رواں اور جنرل سیکرٹری جناب نحوی
صاحب ہی تھے ، اس ادارے کا مقصد اشاعتِ کتب
،سمیناروں، مباحثوں اور مجالس وغیرہ کے ذریعے تعلیماتِ اقبال
کو ان کے صحیح تناظر میں عام کرنا ہے'' ۱۷؎

پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد بشیر احمد نحوی شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی میں لیکچرر منتخب ہوئے۔ڈاکٹر بدرالدین بٹ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''۱۹۸۹ء میں عام روش سے ہٹ کر نحوی صاحب نے دوردرشن
کی مسحور کن (glamorous) ملازمت ترک کر کے کشمیر
یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی لیکچررشپ قبول کی'' ۱۸؎

خود بشیر احمد نحوی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''مجھے یاد آرہا ہے کہ ۱۰ دسمبر ۱۹۸۸ء کو کشمیر یونیورسٹی کی طرف
سے شعبۂ اردو میں بحیثیت اڈہاک لیکچرر تقرری کا میرے حق میں
آڈر صادر ہوا'' ۱۹؎

اس شعبۂ میں سات سال تک کام کرنے کے بعد ۱۹۹۶ء میں کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اقبالیات میں ریڈر منتخب ہوئے اور پھر ۱۹۹۹ء میں اسی شعبہ کے ڈائریکٹر کے منصب پر فائز ہوئے۔سید محمد مجید اندرابی اپنے مضمون 'میرا اہم سفر: تخلیقی سفر کے زیر و بم میں' میں لکھتے ہیں:

''۔۔۔بالآخر خراقبال کا یہ شیدائی ترقی کی منزلوں کو طے کرتا رہا

> اور اپنی محنت شاقہ کی بدولت اسی ادارے کے ڈائریکٹر مقرر
> ہوئے بعد میں انہیں merit کی بنیاد پر open
> categary میں پروفیسر کے عہدہ سے سرفراز کیا گیا'' ۲۰؎

اس کے علاوہ ۲۰۱۳ء میں پروفیسر مجید مضمر کی وفات کے بعد جو شعبۂ اردو کے صدر ہونے کے علاوہ ڈین فیکلٹی آف آرٹس کے عہدے پر فائز تھے، کی ذمہ داری بھی بشیر احمد نحوی کو سونپی گئی۔ بشیر احمد نحوی ڈین کے منصب پر فائز ہونے کے علاوہ کشمیر یونیورسٹی کے south campus کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے، یہ تینوں ذمہ داریاں بیک وقت بشیر احمد نحوی احسن طریقے سے نبھاتے رہے۔ کشمیر یونیورسٹی نے جنوبی کشمیر میں اپنی ایک شاخ قائم کی۔ اس میں دیگر شعبہ جات کے ساتھ ساتھ شعبۂ اردو بھی قائم کیا گیا۔ اس کا سہرا بھی بشیر احمد نحوی کے سر جاتا ہے' جن کی محنت، لگن اور دوڑ دھوپ سے جنوبی کیمپس میں شعبۂ اردو کو قائم کرنے کی منظوری ملی۔ اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے خود بشیر احمد نحوی ایک گفتگو میں کہتے ہیں:

> ''میں وثوق سے کہتا ہوں کہ جنوبی کشمیر کے قائم کردہ کشمیر
> یونیورسٹی کے کیمپس میں شعبۂ اردو ہرگز قائم نہیں ہوتا' اگر میں
> بہت زیادہ تگ ودو نہ کرتا پہلے proposals پہ proposals
> پھر میٹنگ پہ میٹنگ کرتا رہا۔ بالآخر یونیورسٹی کے وائس چانسلر
> پروفیسر طلعت احمد (اللہ انہیں سلامت رکھے) نے منظوری دی''
> ۲۱؎

مارچ ۲۰۱۵ء میں پروفیسر بشیر احمد نحوی کو ایک بار پھر اقبال انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر کے عہدے سے سرفراز کیا گیا ہے۔

شخصیت

اس حقیقت سے شاید ہی انکار کیا جا سکتا ہے کہ ایک ادیب اور شاعر کو فطرتِ انسانی کے مطابق، اپنے زمانے کے سیاسی، سماجی، ادبی اور تہذیبی میلانات سے متاثر ہونا پڑتا ہے۔ اوقات حسنہ نصیب ہونے پر، ماحول کے خارجی اثرات کا عکس اس کے فن پر کچھ اس طرح نمایاں ہو جاتا ہے' جسے سامنے رکھ کر مذکورہ ادیب، شاعر دانشور اور محقق کے عہد کے سیاسی، سماجی، ادبی و علمی، تہذیبی اور تاریخی عوامل کو نہ صرف بخوبی سمجھنے میں مدد ملتی ہے بلکہ انہیں تاریخی شکل میں مدون کرنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ جس طرح فن کے صحیح استعمال میں، شخصیت کا عمل دخل لازم ہے بالکل اسی طرح شخصیت پر عہد اور ماحول کے مخصوص کوائف کا منعکس ہو جانا خارج از امکان نہیں ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں سید عابد لکھتے ہیں:

> ''معاشرے کا تعلق ادیبوں سے اتنا گہرا ہوتا ہے کہ جس وقت وہ کسی تخلیق کو موردِ انتخاب بناتے ہیں تو ان معاشرتی اور ثقافتی کوائف کو ملحوظ رکھتے ہیں' جن کو تصنیف کا نظامِ ہستی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔'' ۲۲؎

راقم کی نظر میں شخصیت کی تعمیر میں انسان کی ظاہری اور باطنی خصوصیات کا مظاہرہ کیا جاتا ہے، جواس کا نہ صرف خاکہ پیش کرتی ہے بلکہ زندگی کے نشیب وفراز، اصول وقواعد، حدود وکوائف، اخلاقی وادبی، اعادات واطوار، رنگ و ڈھنگ، سیرت و کردار، غرض تمام قسم کی ظاہری و باطنی خوبیاں ظاہر کرتی ہے۔اس طرح شخصیت داخلی اور خارجی عناصر کی آمیزش سے مزین ہوتی ہے۔

بظاہر پروفیسر نحوی کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ان کی شخصیت اپنے اندر بہت ساری خوبیاں سمیٹے ہوئی ہے۔نحوی کی مادری زبان کشمیری ہے لیکن وہ کہتے ہیں کہ میرا اوڑھنا بچھونا 'اردو زبان وادب' ہے۔ان کا رنگ گندمی ہے، جیسا کہ، اکثر کشمیریوں کا ہوتا ہے۔ان کے خدوخال سے ذہانت ٹپکتی ہے۔آدمی کے وجود کو اگر باریک بینی سے ایک ہی نظر میں بھی محاکمہ کیا جائے، تو متعلقہ نظریاتی دنیا کے حوالے سے اس میں رہنے، بسنے والی شخصیت کی اصلیت بڑی حد تک سامنے آجاتی ہے۔اس طرح پہلا قدم اٹھانے کے بعد اب راقم کے لئے مناسب ہوگا، کہ میں بشیر احمد نحوی کی ایک قلمی تصویر اتاروں، تاکہ زیر بحث موضوع کو آگے بڑھا سکوں:

> ''بشیر احمد نحوی کی شخصیت اپنے اندر قابل رشک صفات کو سمیٹے ہوئی ہے۔معیاری قد، جسم کی ساخت سے تندرست، پھولی ہوئی چھاتی ان کے سراپے کی جان ہے۔کتابی چہرے پر خط، گھنی بھنویں، موٹے موٹے ہونٹ، کالے سفید چھوٹے چھوٹے بال،

سفید صاف شفاف دانت اور آنکھوں پر چشمہ ان کے سراپا کی

خاص پہچان ہیں۔'' ۲۳؎

پروفیسر نحوی اپنے اوقاتِ کار کے سخت پابند ہیں۔صحیح وقت پر کھانا، صحیح وقت پر پینا، صحیح وقت پر دفتر پہنچنا، صحیح وقت پر مطالعہ کتب کرنا، اپنے مقرر اوقات میں عبادت الٰہی کرنا، ان کی زندگی کا ایسے معمولات ہیں' جس میں کبھی بھی ردو بدل نہیں ہوتا۔صاف ستھرا لباس پسند کرتے ہیں۔گھر میں کرتا، پاجامہ پہنتے ہیں دفتری اوقات میں پتلون اور کوٹ پہنتے ہیں اور جمعہ اور عید کے دن سفید رنگ کا کرتا پاجامہ پہنتے ہیں اور رخوشبو کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔

بشیر احمد نحوی کھانے کا بہت شوق رکھتے ہیں،لیکن کم کھاتے ہیں اور دعوتوں میں کثرت سے نہیں جاتے۔ان کے کھانے کے اوقات مقرر ہیں اور ممکن نہیں کہ خلاف وقت ایک لقمہ بھی تناول فرمائیں۔سبزیوں کا زیادہ استعمال کرتے ہیں۔مچھلی اور مرغ وگوشت تو خود جا کر خریدتے ہیں اور بڑے اہتمام سے پکواتے ہیں۔پھل بھی بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ سگریٹ اور حقہّ سے انہیں نفرت ہے، چائے کے علاوہ گرمیوں میں شربت بھی پی لیتے ہیں۔

خوش مزاجی ان کی شخصیت کا اہم وصف ہے۔لبوں پر مسکراہٹ لئے ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتے ہیں۔قوت برداشت ان کی اس خوبی کو چار چاند لگاتی ہے۔وہ ہر بات دلچسپی سے سنتے ہیں' بشرطیکہ حماقت کی نہ ہو۔ان کے نزدیک سب سے بڑا جرم احمقانہ گفتگو کرنا ہے۔وہ اخلاق کے لحاظ سے مجسّمہ انسانیت ہیں۔ان میں احترام آدمیت کے لئے لامحدود جذبہ رفاقت، ہمدردی موجود ہے اور یہ خوبی ان میں قرآن وسنت اور علوم شرقیہ' نفسیات،

معاشیات، سماجیات، ادبیات عربی، فارسی، اردو، کشمیری اور انگریزی کے گہرے مطالعے سے پیدا ہوئی ہے۔ انہوں نے انسانی فطرت کو ہر پہلو سے دیکھا ہے اور بہت ڈوب کر اس کا مطالعہ کیا ہے وہ طبعاً بہت صفائی پسند ہیں۔ ڈاکٹر سید فضل اللہ اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

''اخلاق کریمانہ کا یہ سخی، فیاض، حلم وعلم کی تشریح جانتا ہے اور جانتا ہے کہ حلیمی سورہ رحمٰن کا آہنگ کیا ہے۔ اس آہنگ کو اپنا شعار بنانے والا ڈاکٹر نحوی اس صفت میں انجیل کی دعا کی نرمی کی آمیزش کرتے ہوئے جب تواضع و احترامِ آدمیت کا فریضہ ادا کرتا ہے تو گنبد سے پہلے مینار یاد آجاتا ہے۔ تفریق فوق وزیست کو نیست و نابود کرنے والا یہ استادِ قلم کا وہ حق دار، وارث اور دوست ثابت ہوتا ہے، جو ذہانت کے تمام مرحلوں سے گزر کر اوج قلم پر ایسے بندھا جاتا ہے کہ قلم اور بشیر احمد نحوی صاحب ایک دوسرے سے گلے لگ کر علم بن گئے۔'' (کذا) ۲۴۔

بشیر احمد نحوی گفتگو کے معاملے میں بڑے سنجیدہ ہیں۔ زیادہ بولنا آپ پسند نہیں کرتے اور آپ کا لہجہ ہر وقت نرم رہتا ہے۔ تعصب اور غصے سے آپ کبھی کسی سے بات نہیں کرتے۔ آپ مخلص ہو کر ہر کسی سے بات کرتے ہیں۔ کوئی مشورہ پوچھتا ہے تو ہمیشہ سوچ سمجھ کر جواب دیتے ہیں۔ محض اپنی نمائش کے لئے بھی گفتگو نہیں کرتے۔ چھوٹے بڑے میں تمیز کر کے ہی آپ اپنی بات کہتے ہیں۔ قہقہہ لگا کر آپ کبھی نہیں ہنستے، بلکہ آپ کے چہرہ پر ہمیشہ

تبسم برلب کی سی کیفیت رہتی ہے۔

بشیر احمد نحوی اپنے عزم اور ارادے کے بڑے پکے ہیں۔ ان میں خودداری کا جذبہ ہر دم موجزن رہتا ہے۔ زندگی کے تمام سرد و گرم ایام میں آپ نے کبھی ہمت نہیں ہاری۔ نفاست وسلیقہ ان کی فطری افتاد ہے۔ ان کی میز پر کتابوں اور کاغذوں کا انبار رہتا ہے لیکن ایک خاص ترتیب کے ساتھ، ہر چیز اپنی جگہ باقاعدہ طور پر ہوتی ہے۔ قلموں کی جگہ الگ، پنسل و چاقو الگ، بال پن، پیڈ' جاذب، پیپر ویٹ سب اپنی اپنی جگہ ہوتے ہیں۔ ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مشغول رہتے ہیں اور یہی ان کی صحت کامل اور تندرستی کا راز بھی ہے۔

پروفیسر بشیر احمد نحوی خوش اخلاق، خوش گفتار ہونے کے ساتھ ساتھ قول وفعل میں یکسانیت کے مالک ہیں۔ انصاف پسندی ان کی خاص پہچان ہے۔

ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی ان کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''ایک استاد، رفیق اور دوست کے طور پر ہم نے پروفیسر بشیر احمد نحوی کو ایک منفرد شخصیت پایا، پرخلوص، خوش مذاق، خوش سلیقہ، مہذب اور دوستوں کی صحبت کو پسند کرنے والے زندہ دل ایسے کہ جس محفل میں ہوں، لطیفہ گوئی سے محفل کو زعفران زار بنا دیں۔ شریف اور منکسر المزاج جو اپنے علم وفن کی برتری کا احساس کبھی دوستوں کو نہ ہونے دیں، بلکہ اس طرح سے معصوم نظر آئیں جیسے وہ ان سے کم تر ہی ہوں'' ۲۵ ۔

بشیر احمد نحوی کی شخصیت تعصب اور عناد سے پاک ہیں ۔ وہ انسانیت کی عزمت انسانیت سے ہی مانتے ہیں اور وہ کسی بھی فرد، چاہے وہ کسی بھی دین و مذہب کا ہو' بغیر کسی تعصب و عناد کے خندہ پیشانی سے ملتے ہیں ۔

پروفیسر بشیر احمد نحوی کے مومنانہ خلوص ،قلندرانہ بے نیازی ،مہم جویانہ جذبے ،منکسرانہ ایثار ، بہادرانہ عزم و ہمت ، مدبرانہ حکمت عملی ، قائدانہ بصیرت ، درویشانہ امید و آس حکیمانہ بالغ نظری ، مشفقانہ ہمدردی و تڑپ اور والہانہ وابستگی و شگفتگی کی وجہ سے ان کا گھر اور دفتر ہمیشہ خلائق سے بھرا رہتا ہے ۔اسی وجہ سے ان کے احباب کا حلقہ بہت وسیع ہے' جو نہ صرف ریاست تک محدود ہے بلکہ بیرون ریاست ، یہاں تک کہ پاکستان میں بھی پروفیسر نحوی کو صفِ اول کی ادبی شخصیات سے دوستانہ مراسم ہیں ۔بشیر احمد نحوی نے ایک گفتگو کے دوران اپنے دوست احباب کی ایک فہرست بتائی' جو حسب ذیل درج ہے :

> ''پاکستان کے پروفیسر رفیع الدین ہاشمی ، دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر عبدالحق ، الہٰ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر علی احمد فاطمی ، جموں یونیورسٹی کے پروفیسر شہاب عنایت ملک ، پروفیسر حامدی کاشمیری ، پروفیسر احمد قدوس جاوید ، پروفیسر مرغوب بانہالی ، پروفیسر حمید نسیم رفیع آبادی' شہناز اقبال قریشی' کشمیر سنٹرل یونیورسٹی سے پروفیسر نذیر احمد ملک' پروفیسر مشعل سلطان پوری ، غلام نبی خیالؔ' پروفیسر اسداللہ وانی' کشمیر یونیورسٹی سے پروفیسر

شادرمضان، ڈاکٹر الطاف آہنگر، ڈاکٹر ریاض توحیدی، ڈاکٹر فیاض احمد فیض، ڈاکٹر سلیم سالک، ڈاکٹر مشتاق احمد وانی، ڈاکٹر عرفان عالم، ڈاکٹر نذیر آزاد، ڈاکٹر شفق سوپوری، ڈاکٹر جوہر قدوسی، ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی، ڈاکٹر معید الظفر، ڈاکٹر فریدہ کول، ڈاکٹر عزیر حاجنی، ڈاکٹر بدرالدین بٹ، ڈاکٹر پیر نصیر احمد، رخسانہ جبین (موجودہ ڈائریکٹر ریڈیو کشمیر سرینگر) فاروق نازکی، ایاز ناکی، محمد اشرف ٹاک، وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں''۔ ۲۶ ؎

پروفیسر بشیر احمد نحوی ایک بہترین رفیق کار ہونے ساتھ ساتھ ایک فرمانبردار فرزند، ایک بہترین شوہر، اور ایک شفیق والد کی حیثیت سے اپنی مثال آپ ہیں۔ان کی فرماں برداری کے حوالے سے ڈاکٹر سید مجید اندرابی اپنے مضمون میں یوں لکھتے ہیں:

''نحوی اپنی گھریلو زندگی میں ایک فرمانبردار فرزند ہیں۔ والدین کی ضعیف العمری کا انہیں ہر وقت خیال رہتا ہے۔ایک سو دس کلومیٹر کی روزانہ مسافت طے کر کے ڈیوٹی کی انجام دہی کے بعد ہر صبح وشام والدین کی قدم بوسی کو متاع زندگی گردانتے ہیں۔نحوی بیک وقت شفیق دوست بھی ہیں اور استاد بھی ،سنجیدہ بھی ہیں اور بےلوث بھی ،خدا ترس بھی ہیں اور زندہ دل بھی ،آئے دن ان کی باتوں میں اس قدر ظرافت ولطافت ہے کہ مجلس میں رنگ بھرتے

ہیں اور محفل کی زینت کو دوبالا کرتے ہیں۔'' ۲۷؎

بشیر احمد نحوی کی ازدواجی زندگی نہایت خوشگوار ہے۔ ان کے دو بیٹے وسیم احمد نحوی اور محمد ظفر نحوی اور دو بیٹیاں ہے۔ ان کے چاروں بچے نور تعلیم سے منور ہیں۔ ان کا بڑا بیٹا وسیم نحوی کشمیر یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کر رہا ہے۔ ظفر نحوی کالج میں زیر تعلیم ہے اور ان کی بڑی بیٹی کی شادی ہوگئی ہے اور چھوٹی بیٹی انٹرمیڈیٹ کی پڑھائی کر رہی ہیں۔

بشیر احمد نحوی اپنے بچوں کے لئے ہمیشہ فکر مند رہتے ہیں۔ آج کی اخلاقی بے راہ روی کے دور میں پروفیسر نحوی ان کی بہترین پرورش و تربیت کی خاطر جی جان سے کوشش کرتے ہیں۔ بشیر احمد نحوی کے بچوں سے اپنے شفیق والدین کے بارے میں پوچھنے سے یہ محسوس ہوا ہے کہ ایسے والدین ہونے کو وہ سب ہی اپنے لئے انتہائی خوش قسمتی سمجھتے ہیں۔ کیونکہ بشیر احمد نحوی اپنے بچوں کی مناسب پرورش اور تربیت کرنے میں جتنی دلچسپی لیتے ہیں، شاید ہی آج کے اس ترقی اور دوڑ داڑ بھرے معاشرے میں والدین اتنی دلچسپی لیتے ہیں۔

یہاں پر بشیر احمد نحوی کی اہلیہ کا ذکر خیر کرنا بھی مناسب ہوگا، کیونکہ مرد کی شخصیت کو نکھارنے کے پیچھے ہمیشہ کسی نہ کسی بہترین عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ ان کی رفیقہء حیات نہایت ہی با ذوق، تعلیم یافتہ، خوش اخلاق، نرم دل اور صوم وصلواۃ کی پابند ہیں۔ پروفیسر نحوی اپنی شریک حیات کے حوالے سے یوں بیان کرتے ہیں:

> ''میری اہلیہ ایک مہذب خاتون ہے۔ آپ تعلیم یافتہ، خوش اخلاق ہے، نرم دل بھی اور صبر و قناعت کی جیتی جاگتی مثال بھی

ہیں ۔آپ ہمیشہ اپنے اہل خانہ کا خاص خیال رکھتی ہیں ۔ایک
دین دار خاتون کی طرح صوم وصلواۃ کی پابند ہے۔'' ۲۸ ؎

خود پروفیسر نحوی ایک اچھے انسان ہیں ۔خلیق وملنسار' نرم دم گفتگو گرم دم جستجو' ان کی میٹھی ،نرم اور پروقار گفتگو استفادہ کے لائق ہوتی ہے۔محنت' جانفشانی اور تلاش وتحقیق میں نحوی کی سرگرمیاں جوانوں کے لئے بھی باعث رشک ہیں ۔ان کا حافظہ بہت قوی ہے،حافظ کلام اقبال ہونے کے ساتھ ساتھ اردو،عربی ، فارسی اور انگریزی کے صفِ اول کے شعراء اور ادباء کے سینکڑوں اشعار اور اقتباسات ازبر ہیں ۔سید مجید محمد اندرابی اسی خصوصیت کے پیش نظر اپنے مضمون میں لکھتے ہیں :

''حافظہ اس قدر قوی کہ شاعر مشرق کے کم وبیش دس ہزار اشعار زبانی یاد ہیں ۔ اقتباسات ،قصص وامثال، تذکرہ نگاروں کے تراشے و اقتباسات، ناقدین کی آراء ، مفسرین کے بین التفاسیری مطالعات، تاریخ اسلام کے اہم واقعات، اسلامی حکایات وغزوات ،قدیم فلاسفہ کے خیالات ونظریات ،عربی شعر وادب کے علاوہ اخوان الصفا کے تذکرے،قلی قطب شاہی دور کی اردو سے لے کر حلقہ ارباب ذوق تک کے حالات ووقعات پر گہری نظر رکھنے والا نحوی کیا ہی عین الطبع ونرم مزاج انسان ہے۔'' ۲۹ ؎

بشیر احمد نحوی بحیثیت استاد اپنا ثانی نہیں رکھتے ہیں۔ان کا پڑھایا ہوا سبق نقش بر سنگ ہو جاتا ہے اور اپنا دیر پا اثر چھوڑ جاتا ہے۔راقم الحروف نے کئی طلباء سے بشیر احمد نحوی کی تدریسی خصوصیات کے حوالے سے پوچھا تو جوابات اس اعتراف میں ملے کہ نحوی صاحب کی شخصیت کی طرح ان کی مُدرسی اپنی مثال آپ ہے۔نذیر احمد گنائی ، پی۔ایچ۔ڈی اسکالر شعبۂ اقبالیات کا بیان ملاحظہ ہو:

''نحوی صاحب کی مُدرسانہ خوبیوں کے حوالے سے میں اتنا کہہ سکتا ہوں ع ؎

درس ادیب اگر بود زمزمۂ محبتے

جمعہ بمکتب آورد طفلِ گریز پاے را

نظیریؔ

اور وہ ساری خصوصیات نحوی صاحب کی شخصیت میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔'' ۳۰؎

پروفیسر بشیر احمد نحوی ایک کامیاب زندگی گذار رہے ہیں۔انہیں شہرت ملی ہے، نیک نامی ہوئی ہے۔معاشی طور پر بھی تنگ دستی کے شکار نہیں ہوئے اور سب سے بڑھ کر ایک انسان کے لیے اس کے سوا کیا ہوسکتا ہے کہ عوام وخواص اچھے الفاظ سے اُسے یاد کریں۔ پروفیسر نحوی ریاست بھر میں عزت و احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں اور اردو ادب میں مسلمہ طور پر بقول پروفیسر عبدالحق ''اقبالیات کی طاقتور آواز'' کے بطور ان کا کنٹربیوشن اتنا وقیع ہے کہ اقبالیات کے ہر تذکرے میں ان کا حوالہ ناگزیر ہے۔

حوالہ جات

۱۔ بحوالہ ارمغان نحوی ص ۲۰۱
۲۔ جامعہ کشمیر اور اقبالیات از بدرالدین بٹ ص ۵۱۵
۳۔ ارمغان نحوی مرتب بشیر احمد نحوی ص ۴۲۶
۴۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً ص ۲۸۹
۵۔ تاریخ انبیاء مرتب بشیر احمد نحوی ص ۶۔۵
۶۔ بحوالہ محسوسات از بشیر احمد نحوی ص ۱۱۴
۷۔ بحوالہ مضمون از سید فضل اللہ سمینار ۲۰۰۰ء
۸۔ احساس وادراک از بشیر احمد نحوی ص ۱۶۳
۹۔ بحوالہ محسوسات از بشیر احمد نحوی ص ۱۱۴
۱۰۔ جموں کشمیر کے اردو مصنفین از جان محمد آزاد ص ۳۲۱
۱۱۔ محسوسات از بشیر احمد نحوی ص
۱۲۔ ایضاً ایضاً ص ۱۱۴
۱۳۔ جامعہ کشمیر اور اقبایات از بدرالدین بٹ ص ۵۱۶
۱۴۔ بحوالہ محسوسات از بشیر احمد نحوی ص ۱۱۴
۱۵۔ جمعہ کشمیر اور اقبالیات از بدرالدین بٹ ص ۵۱۶
۱۶۔ بحوالہ محسوسات از بشیر احمد نحوی ص ۱۱۴
۱۷۔ جامعہ کشمیر اور اقباایات از بدرالدین بٹ ص ۵۱۸
۱۸۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً ص ۵۱۷
۱۹۔ بحوالہ مرغوب بانہالی بحیثیت اقبال شناس از ڈاکٹر پیر نصیر احمد ص ا
۲۰۔ بحوالہ مضمون از سید مجید اندرابی مطوعہ اقبال انسٹی ٹیوٹ سرینگر
۲۱۔ بحوالہ شخصی انٹرویو از بشیر احمد نحوی بمقام بجبہاڑہ بتاریخ ۵۔۷۔۲۰۱۵ء بہ وقت ۸:۰۰ بجے
۲۲۔ سید عابد قومی زبان کراچی انجمن اردو شمارہ ۶ ستمبر تا اکتوبر ۱۹۶۰ء ص ۳۲
۲۳۔ بحوالہ تاثرات از راقم السطور۔ ۲۰۱۴ء
۲۴۔ بحوالہ مضمون از سید فضل اللہ مطبوعہ قبال انسٹی ٹیوٹ سرینگر
۲۵۔ شخصی انٹرویو از ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی بمقام کشمیر یونیورسٹی تاریخ اپریل ۲۰۱۳ء

۲۶۔ بحوالہ مضمون ازسد مجید اندرابی مطبوعات اقبال انسٹی ٹیوٹ سرینگر ۵
۲۷۔ بحوالہ شخصی انٹرویو از بشیر احمد نحوی جنوبی کیمپس کشمیر یونیورسٹی ۷ ستمبر ۲۰۱۵ء
۲۸۔ بحوالہ شخصی انٹرویو از بشیر احمد نحوی بمقام سرینگر تاریخ ۱۸ مارچ ۲۰۱۳ء
۲۹۔ بحوالہ مضمون ازسید مجید اندرابی مطوعہ اقبال انسٹی ٹیوٹ سرینگر
۳۰۔ گفتگو از نذیر احمد گنائی، پی ایچ ڈی اسکالر شعبہ قابالیات کشمیر یونیورسٹی ۲۹ ستمبر ۲۰۱۵ء

باب سوم

بشیر احمد نحوی کے معاصرین کا اجمالی جائزہ

اردو ادب کے عالمی منظر نامے پر نظر دوڑھائی جائے، تو ہر دور میں اخذ و قبول، ردِ عمل، اثر و نفوذ اور روایت کی پاسداری اور دوسروں سے متاثر ہونے کا عمل صاف نظر آتا ہے۔ ہر عہد میں موجود ادباء و شعراء اپنے متاخرین و معاصرین کے اثرات ضرور قبول کر لیتے ہیں اور بعض اوکات اپنے آپ کو کسی حد تک اسی رنگ میں رنگنے کی کوشش کرتے دیکھائی دیتے ہیں، جو اس دور کا غالب رنگ ہوتا ہے۔اسی کے پیشِ نظر یہاں پر اگر یہ کہا جائے کہ جسے بزرگی کی آرزو ہو، اس کے لئے بزرگوں کی رہ گزر پر چلنا ضروری ہے اور غالباً ولی کا یہ شعر اس کی صاف صاف عکاسی کرتا ہے۔ ؎

اے بے خبر اگر ہے دنیا میں بزرگی کی آرزو
دنیا کی رہ گزر پر بزرگوں کی چال چل

اپنے معاصرین سے اثرات لینے کے باوجود ترقی کے زینے طے کرنا' اپنی راہ الگ نکالنا اور اس میں اختصاص حاصل کرنا بڑی بات ہے۔ بعض لوگ تو دوسروں کی پیروی یا اثر و نفوذ کے گورکھدندوں میں اس طرح کھو جاتے ہیں کہ بجائے ترقی کے تنزل کا شکار ہو جاتے ہیں' یہاں تک کہ اپنی پہچان ہی کھو دیتے ہیں۔ اس کے برعکس ایسے اصحاب فکر وفن بھی ہیں' جو ایک طرف روایت کی پاسداری کرتے دیکھائی دیتے ہیں' تو دوسری طرف اپنی ذہنی اور تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے' اپنی ایک الگ راہ نکالنے میں کامیاب نظر آتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ان اثرات کو اپنے تخلیقی اور تہذیبی مزاج سے ہم آہنگ کرنے کی مستحسن کوشش کرتے ہیں۔

بشیر احمد نحوی کی شخصیت میں بھی اخذ و قبول' ردعمل اور دوسروں سے فیضیاب ہونے کے اثرات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ پروفیسر موصوف زمانہ طالب علمی ہی سے علمی وادبی سرگرمیوں کی طرف راغب ہوئے۔ چنانچہ ورثہ میں ملا ادبی ذوق ان کے اندر ایک متحرک جزو کی طرح سرایت کرتا رہا اور غالباً ان کی تحریرات میں ان کے خاندانی اثرات کا سب سے زیادہ عمل دخل ہے۔ پروفیسر بشیر احمد نحوی اپنی ادبی زندگی کے پس وپیش میں دوسرے باذوق قلمکاروں سے اثرات جذب کرتے رہے' یہاں تک کہ پروفیسر موصوف کی خداداد ادبی صلاحیتیں اپنی پرتو دکھاتے ہوئے' ان کے معاصرین کی توجہ کا مرکز بنے رہے۔ مذہبیات' تصوف' شعر وادب کی فکر کرنا اقبال اور مطالعات اقبال ان کے پسندیدہ موضوعات میں سے ہیں۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی اردو ادب بالخصوص اقبال اور مطالعات اقبال میں صرف کی ہے اور

اس میں ایسا عبور حاصل کہ کہ زبان زدعوام وخواص ''حافظ اقبال'' مشہور ومقبول ہیں۔ راقم نے ایک بار ایک گفتگو کے دوران ان سے پوچھا کہ مالک کل کی طرف سے آپ کو بے شمار صلاحیتیں ودیعت ہوئی ہیں' تو آپ نے ادب کے دیگر شعبہ جات (تخلیقی اعتبار سے) کی طرف توجہ کیوں نہیں کی۔ یہ بات انہیں کسی حد تک ناگوار گزری اور جواباً پروفیسر نحوی نے فرمایا' 'میری آرزو بھی ہے اور مجھے فخر بھی ہوگا کہ میری آنے والی تمام نسلیں اسی دشت کی سیاحی میں سرگرداں رہے'۔ اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پروفیسر نحوی کس قدر اقبال اور اقبالیاتی ادب سے عقیدت رکھتے ہیں۔

یہ توصیفی کلمات پروفیسر نحوی کے مختصر تعارف کے طور پر جملہ گزارشات میں سے ہیں' لیکن اگر موضوع کا دائرہ اور کنیوا س پھیلایا جائے تو پروفیسر بشیر احمد نحوی حال کے مرکب شہرہ پر سوار نظر آتے ہیں اور مستقبل کے ہر حد کو پھلانگنے والے رتبہ آفاقیت میں ہمائے عظمت محسوس ہوتے ہیں۔ ؎

میں کہاں رکتا ہوں عرش وفرش کی آواز سے
مجھ کو جانا ہے بہت دور اونچا پرواز سے

کسی بھی تحریک یا مشن کو کامیابی سے ہمکنار کرانے میں ہر دور میں باصلاحیت شخصیات کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس حقیقت کے تناظر میں دیکھیں تو ریاست میں اقبال شناسی اور اقبال فہمی کی اس منظم اور مربوط تحریک کو ارتقاء وترقی کی جانب لے جانے میں وادی کشمیر سے تعلق رکھنے والے نامور اور بے بدا اقبال شناس پروفیسر بشیر احمد نحوی کا فعال کردار بڑی

اہمیت کا حامل ہے۔ یہاں پر یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ علامہ اقبال کے فکر وفن اور شخصیت کے مختلف گوشوں کو اجاگر کرنے کی اس تحریک میں بشیر احمد نحوی کے معاصرین نے خاص کردار ادا کیا ہے۔ پروفیسر نحوی جن معاصرین ادباء وشعراء، مفکروں دانشوروں، محققوں اور ناقدین سے متاثر ہوئے یا جو پروفیسر نحوی کی تحریرات سے اثر لیتے رہے، ان میں پروفیسر حامدی کاشمیری، پروفیسر اکبر حیدری، پروفیسر مرغوب بانہالی، حکیم منظور، خواجہ ثنا اللہ بٹ، پروفیسر محمد زماں آزردہ، پروفیسر مجید مضمر، پروفیسر ظہور الدین، پروفیسر غلام رسول ملک، پروفیسر نسیم رفیع آبادی، پروفیسر محمد امین اندرابی، پروفیسر تسکینہ فاضل، ڈاکٹر پریمی رومانی، ڈاکٹر فرید پربتی، ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی، ڈاکٹر شہناز اقبال قریشی، ڈاکٹر اسد اللہ وانی، محمد اشرف ٹاک، ڈاکٹر محمد مجید اندرابی، ڈاکٹر سید فضل اللہ، ڈاکٹر ریاض توحیدی، ڈاکٹر فیض احمد فیاض وغیرہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس فہرست میں کئی اور نام بھی آسکتے ہیں لیکن یہاں پر پروفیسر نحوی کے چند ممتاز معاصرین کا ہی اجمالی جائزہ پیش کیا جارہا ہیں۔ جو کسی نہ کسی صورت میں بشیر احمد نحوی کی ادبی وفکری جہاں سے میل کھاتے ہیں۔

آیئے اب پروفیسر نحوی کے ممتاز معاصرین کا اجمالی جائزہ پیش کیا جائے:

پروفیسر حامدی کاشمیری بڑے ہی معتبر اور بزرگ، ادیب، محقق، شاعر، فکشن نگار ہیں۔ جنھوں نے اپنی گراں قدر خدمات سے اردو ادب کو مالا مال کیا ہے۔ آپ کا اصلی نام حبیب اللہ ہے، جس کا تذکرہ حامدی نے اپنے شعری مجموعے ''لاحرف'' میں یوں کیا ہیں:

''حبیب کے نام۔۔۔ جو میرا ہمراز ہے۔'' [1]

حامدی کاشمیری اردو زبان وادب کے ایک جری سپاہی ہیں۔ انھوں نے چالیس برس تک اردو کے تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی ادب میں گراں قدر اضافے کئے ہیں اور ان کا یہ سفر ہنوز جاری ہے۔ انہوں نے اپنے ادبی سفر کے دوران درجنوں تصانیف پیش کر کے نئے امکانات کو روشن کیا ہے۔ حامدی کاشمیری ایک پہلودار شخصیت ہے۔ انہوں نے اپنی ادبی زندگی میں بالخصوص ریاست جموں وکشمیر اور بالعموم اردو ادب پر گراں خدمات انجام دے کر اپنے فکر وفن سے قارئین کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے۔ اس حوالے سے نور شاہ رقمطراز ہیں:

''پروفیسر حامدی کاشمیری کی علمی اور ادبی زندگی کے کئی روپ ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کی شخصیت میں کئی شخصیتیں پوشیدہ ہیں اور ہر شخصیت علم کی روشنی سے منور ہے وہ افسانہ نگار ہیں، شاعر ہیں، ناقد ہیں، اور ایک معتبر استاد بھی ہیں۔'' ۲؎

ان کا تخلیقی سفر ایک ایسے نکتہ سے شروع ہوا، جہاں وہ موجودہ اور قابل شناس معروضی حقیقت سے انقطاع کرنے لگے اور خالصتاً شخصی سطح پر شعور اور لاشعور کے عمل اور رد عمل کے تحت خوابوں کی دھند میں کسماتے ہوئے وحشی، نادیدہ اور نادر کار پیکروں کی شناخت کرنے لگے۔ یہ سیال پیکر ان کے داخلی وجود کا ناگزیر حصہ بن گئے اور بقول نور شاہ:

''ان کی شاعری، افسانوی اور تنقیدی تخلیقات اور تصانیف کا جائزہ لینے سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے، کہ وہ

نہ صرف لفظ معنی اور زبان و بیان کی تمام تر نزاکتوں سے بخوبی
آشنا ہیں، بلکہ اس بات کا بھی احساس ہوتا ہے کہ انہیں فکر و فن پر
مکمل اعتماد حاصل ہے۔'' ۳؎

حامدی کاشمیری نے ادب شناسی کے لئے معاصر تنقیدی روشوں کا گہرا شعور حاصل کیا اور اس طرح ان کا پہلا تنقیدی و تحقیقی کارنامہ ''جدید اردو نظم اور یوروپی اثرات'' پیش پیش ہے۔ڈاکٹر برج پریمی لکھتے ہیں:

''حامدی نے عرق ریزی سے جدید اردو نظم کے شعوری اور معنوی
پہلوؤں کا مطالعہ کیا ہے۔ اردو نظم پر یوروپی اثرات کی نشاندہی
کر کے خالص تجزیاتی مطالعہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ
مطالعہ حالیؔ اور آزادؔ کے عہد سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کی نظمیہ
شاعری پر محیط ہے۔اس کتاب کے بیشتر حصے تحقیقی نوعیت کے
ہیں۔ جہاں انہوں نے اردو شاعری کے دور قدیم میں نظم کی
اصطلاحات کی روایات اور اس کے ابتدائی نقوش کو تلاش کیا
ہے۔اس کے بعد کا حصّہ تنقیدی ہے۔'' ۴؎

حامدی کاشمیری نے ادب شناسی کے لئے معاصر تنقیدی رویوں کا گہرا مطالعہ کیا اور اپنی محققانہ اور ناقدانہ بصیرت کا اظہار ''غالب کے تخلیقی سرچشمے'' سے کیا ہے۔ اس میں حامدی نے کہیں نفسیاتی نظریے نقد اور کہیں لسانیات کا سہارا لے کر غالب کے تخلیقی

سرچشموں تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔اس کے علاوہ ان کے تنقیدی نظریات' نئی حسیت اورعصری اردو شاعری ، کارگہ شیشہ گری، امکانات، تفہیم تنقید میں ملتے ہیں۔ حامدی کی ایک اورکتاب اقبال اورغالب اپنی انفرادی شان رکھتی ہے ۔ یہ کتاب تین حصّوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں شاعری کی تعریف ہے' حصہ دوم غالب اوراقبال کی جدت پسندی سے مزئین ہیں اورتیسرے حصے میں اقبال کے تخلیقی عمل پر سیر حاصل گفتگوملتی ہے۔آل احمدسروراس حوالے سے لکھتے ہیں :

''خصوصی مطالعوں میں حامدی کی کتاب ''اقبال اورغالب''
بھی انفرادی شان رکھتی ہے۔ دونوں شاعروں کی شعری حسیت
کے تخلیقی محرکات کا پورامطالعہ اردو میں چناہے۔'' ۵؎

ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے اسے نئے انداز کی کتاب کہاہے اورڈاکٹر گوپی چندنارنگ دونوں شاعروں کے اس طرز کے تقابلی مطالعے کو اچھوتا قرار دیتے ہیں۔حامدی کاشمیری کا طرہ امتیاز صرف یہی نہیں ہے کہ انہوں نے ایک ایسے تنقیدی نظریے کی بنیاد ڈالی جس نے نہ صرف اردوتنقیدی دنیا میں ایک نئے ادبی Disoure کوجنم دیا' بلکہ انہوں نے اس کے اطلاقی عملی نمونے بھی پیش کئے' جو انہیں دوسرے نظریہ ساز نقادوں کے مقابلے میں اہم اورمنفرد مقام تفویض کرتا ہے۔ان کی مقبول تصانیف میں کارگہ شیشہ گری' آئینہ ادراک' اکتشافی تنقید کی شعریات' غالب جہاں دیگرے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے نظیراکبرآبادیؔ، حالیؔ، اقبالؔ، فیضؔ، مجیدامجدؔ، وزیر آغاؔ، سردارجعفریؔ، مخدوم محیی الدینؔ،

ناصر کاظمیؔ، بلراج کومل ؔ، شہر یاؔ اور مظہر امامؔ کی شعری تخلیقات کے ساتھ ساتھ پریم چند، منٹو، بیدی، کرشن چندر، قراۃ العین حیدر، انتظار حسین، رشید امجد، سریندر پرکاش اور شوکت حیات کے افسانوں کے تجرباتی مطالعے پیش کئے ہیں۔ حامدی کاشمیری کی تخلیقی' تنقیدی وتحقیقی خدمات کا اعتراف اردو کے معتبر اور مستند نقادوں نے وقتاً فوقتاً کیا ہے۔ ڈاکٹر انور سید ید کا قول ہے کہ ڈاکٹر حامدی کاشمیری تنقیدی روشنی سے دستیاب اجالے میں سفر نہیں کرتے۔

حامدی کی اب تک تیس سے زائد کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ وہ مسلسل تیزی اور گرمجوشی سے اس سفر میں نئے نئے منازل کی تلاش وجستجو میں سرگرم عمل ہیں۔

اکبر حیدری :۔ ڈاکٹر اکبر حیدری کا نام ریاست کے نامور ناقدین میں آتا ہے۔ ان کی پیدائش ۱۳ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو سرینگر کے محلے محمد خانقاہ موختہ میں ہوئی۔ یہ تاریخ پیدائش صد فیصد صحیح نہیں ہے۔ چنانچہ اکبر حیدری کا بیان اس حوالے سے ملاحظہ ہو:

''مجھے یہ یاد ہے' کہ جب میں اپنے والد صاحب کے ساتھ داخلے کے لئے پرائمری اسکول میں گیا' تو ٹیچر نے ان سے پوچھا کہ ان کی تاریخ ولادت کیا ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ صحیح تاریخ یاد نہیں ہے تو ٹیچر نے اپنی طرف سے تاریخ پیدائش لکھی'' ۶؎

ابتدائی تعلیم کے بعد اکبر حیدری نے ایم۔اے فارسی، ایم۔اے اردو (پرائیوٹ) طور پر علی گڑھ سے کیا اور بعد میں پی۔ایچ۔ڈی اور ڈی لٹ کی ڈگریاں بھی حاصل کئیں۔ اکبر حیدری اپنے طالب علمی کے زمانے کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

''میرے طالب علمی کے زمانے میں کشمیر اتنا پسماندہ اور مفلس زردہ علاقہ تھا۔ جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی تھی۔ میرے گردونواح میں کوئی مسلمان پڑھا لکھا نہیں تھا البتہ پنڈت گھرانوں کے افراد تعلیم یافتہ تھے اور بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ ان میں سے پنڈت درگا پرساد بھی تھے جو بعد میں ہندوستان کے وزیر خارجہ ہو گئے۔'' ۷؎

اکبر حیدری نے اپنی تحقیقی وتنقیدی بصیرت کا ثبوت اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے سے ہی دیا جو بعنوان ''میر انیس بحیثیت رزمیہ شاعر'' تھا۔ یہ مقالہ انہوں نے پروفیسر سید حسین موسوی کی نگرانی میں پایہ تکمیل کو پہنچایا۔ ۱۹۸۲ء میں اکبر حیدری کشمیر یونیورسٹی میں ریڈر کی حیثیت سے مقرر ہوئے۔ اس کے بعد انہیں سنٹرل یونیورسٹی حیدرآباد میں بحیثیت پروفیسر اپنا کام سرانجام دینے کا موقع ملا۔ اکبر حیدری کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ وہ پہلے کاشمیری ہیں جسے فیلوشپ گرانٹ ملا۔ اکبر حیدری ایک جینیس تھے۔ وہ جہاں بھی رہے، علمی اور ادبی دنیا کو مالا مال کرتے رہے۔ چنانچہ اپنے تعلیمی زمانے سے ہی انھیں اردو کے بڑے سورماؤں کے کتب خانوں سے براہ راست فیض حاصل کرنے کا موقع ملا، جن میں پروفیسر مسعود حسین رضوی ادیب، شبلی نعمانی، راجہ صاحب محمود آباد، جعفر علی خان اثر لکھنوی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے اردو ادب کے اعلیٰ پایہ ہستیوں سے تبادلہ خیال کیا ہے، ایسی نادر شخصیات میں نیاز فتحپوری، سید احتشام حسین، علی عباس حسینی، نورالحسن

ہاشمی، مسعود حسین رضوی، سید سلیمان علی نقوی، سید کلب حسین، سید اختر علی طاہری وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اکبر حیدری نے اپنی محنت لگن ایمانداری سے درس و تدریس اور تحقیق وتنقید کے منصب جلیل پر فائز ہوکر اسے احسن طریقے سے نبھایا' ان کی شخصیت اپنے اندر ایک ادارہ تھی اور بحیثیت محقق و ناقد کے ایک دبستان تھے۔خودداری، ذہانت، لیاقت ان کے اوصاف حمیدہ میں سے تھے انہوں نے بڑی عرق ریزی' جاں سوزی اور یکسوئی سے ادبی کام کیا۔ پروفیسر احمد قدوس جاویدان کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''دنیا جانتی ہے' کہ اکبر حیدری ایک عالم ہیں۔ وہ شعروادب کی تفہیم وتعبیر اور تحقیق وتوضیح کے ان تمام مرحلوں سے گزر چکے ہیں' جوکسی بھی ادب شناس کو ایک مثالی شخصیت بنانے کے لئے کافی ہوتے ہیں۔اکبر حیدری کے اس مقام اور مرتبہ سے انکار ممکن نہیں پھر بھی اگر کسی کو اس حقیقت کے اعتراف میں تکلف ہوتو اُسے اکبر حیدری کی تصنیف ''میر انیس بحیثیت رزمیہ شاعر، بہار ستان شاہی، نوادر غالبؔ وغیرہ چند ایک نمائندہ تصانیف کے علاوہ بطور خاص ان کی حالیہ کتاب'' اقبال اور علامہ شیخ زنجانی'' کا مطالعہ کرنا چاہیے۔''۸؎

اکبر حیدری صاحب تصانیف تھے۔ ان کی اب تک ۷۰ سے زائد کتابیں ہندوستان

اور پاکستان سے شائع ہوئی ہیں۔اس کے علاوہ ان کے ڈھائی ہزار سے زائد مضامین ملک بھر کے رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔اس حوالے سے خود ان کا ایک بیان ملاحظہ ہو:

''اگر میرے مطبوعہ مضامین کا انتخاب کیا جائے تو پچاس ساٹھ کتابیں مرتب ہوسکتی ہیں۔ میرے پاس غیر مطبوعہ تحقیقی مضامین کا بڑا ذخیرہ ہے۔اس ذخیرہ میں چالیس پچاس ضخیم کتابیں وجود میں آسکتی ہیں۔'' ۹ ؎

اکبر حیدری نے تحقیقی میدان میں اور خاص کر اقبالیات کے شعبے میں گراں قدر خدمات دئے۔ڈاکٹر جوہر قدوسی ان کی بعض اقبالیاتی خدمات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر حیدری نے بعض ایسے انکشافات کئے' جو محققین اقبال کے لئے نئے بھی تھے اور دلچسپ بھی اور جن کا حوالہ بعد میں کئی محققوں نے اپنی تحریروں میں دیا۔'' ۱۰ ؎

ایسے انکشافات میں خاندان اقبال کی اصلیت' اقبال اور عطیہ فیضی بیگم' اقبال اور علامہ شیخ زنجانی' اقبالیات کے نئے گوشے اور سب سے بڑا رسالہ ''حکیم الامت'' کا اجرائ۔ رسالہ ''حکیم الامت'' پہلی مرتبہ ۲۰ اگست ۲۰۰۶ء میں سرینگر سے شروع ہوا۔اس رسالے کے حوالے سے ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں:

''یہ جان کر دلی مسرت ہوئی' کہ پروفیسر اکبر حیدری ''حکیم الامت'' کے نام سے ایک رسالہ جاری کررہے ہیں۔ مجھے

انتہائی خوشی ہے کہ حیدری صاحب نے اقبال جیسے عظیم شاعر پر رسالہ نکالنے کا فیصلہ کیا۔ دعا کرتا ہوں کہ خدا حیدری صاحب کو اپنے مقصد میں کامیاب کرے اور حکیم الامت کو اردو کا اہم ترین رسالہ بنادے۔'' ۱۱؎

حکیم منظور:۔ نام محمد منظور، حکیم اسم نسبی ہے اور قلمی نام حکیم منظور ہے۔ آپ کی تاریخ پیدائش ۲۵ دسمبر ۱۹۳۸ء ہے۔ شعر گوئی کی شروعات ۱۹۶۴ء کے آس پاس میں کی۔ پہلے افسانے لکھتے تھے۔ حکیم منظور کا پہلا شعری مجموعہ'' ناتمام ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا۔ لہو لمس چنار ۱۹۸۲ء میں، برف رتوں کی آگ ۱۹۸۸ء میں، خوشبو کا نام نیا ۱۹۹۰ئ، پھول مشفق آنگن کے ۱۹۹۲ء میں، شعر آسمان ۱۹۹۵ء، صبح شفق تلاوت ۱۹۹۷ء اور قلم زبانی شگاف ۲۰۰۵ء میں یکے بعد دیگرے شائع ہوئے۔ موخر الذکر مجموعے کا انتساب حکیم منظور نے بشیر احمد نحوی کے نام کیا ہے۔

حکیم منظورؔ نے نظم، غزل، رباعی، دوہے، ہائیکو، کہہ مکرنیاں میں طبع آزمائی کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تنقید اور تاریخی مضامین بھی لکھے ہیں، جو ملک بھر کے جرائد میں چھپ چکے ہیں۔ انھوں نے اقبالیات پر ایک کتاب ''اقبال ایک تذکرہ'' لکھ کر اقبالیاتی ادب میں اچھا خاصا کام کیا ہے۔ سیدہ نکہت فاروقی نظر لکھتی ہیں:

''شاعری کے میدان میں اپنا لوہا منوانے کے ساتھ ساتھ حکیم منظور نے ایک قابل نثار ہونے کا ثبوت بھی پیش کیا۔ ان کے کئی

افسانے (جو نایاب ہیں) تبصروں اور تنقیدی مضامین کے علاوہ اقبال ایک تذکرہ نامی کتاب اہم نثری کارنامہ ہے۔ یہ کتاب مارچ ۲۰۰۵ء میں شائع ہوئی ہے۔حکیم منظور نے یہ کتاب خاص طور پر اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کشمیر یونیورسٹی سرینگر کے لئے لکھی ہے، جو کئی ابواب پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب اقبال فہمی میں بڑی معاون و مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔'' ۱۲؎

حکیم منظور کی شاعری کی امتیازی خصوصیات یہ ہیں، کہ جذبہ اور احساس کی ایک زرین رو اور ایک فعال ذہانت اس کا تانا بانا فراہم کرتے ہیں اور یہ دونوں عناصر ان کی نادر شخصیت اور مخصوص انفرادی فکر ونظر کے آئینہ دار ہے اور فکر وندرت ان کے مشاہدے، ان کے اسلوب اور ان کی لفظیات سب کے اندر جلوہ گر ہے۔ اس کی صدا سے گونگے پائل جیسے کہتے ہیں، کہ بچوں جیسا خوش ہوتا ہوں جب بارش ہوتی ہے۔ راج نارائن راز لکھتے ہیں:

''حکیم منظور کے یہاں جداگانہ فکری سطح پر الفاظ کے تخلیقی استعمال کی ایک علامت تجریدی تمثیل ہے، جو بیک وقت اس کے انداز مشاہدہ اور اسلوب کا حصّہ ہے۔'' ۱۳؎

حکیم منظور کی لذت فکر، ان کی بحروں کی مخصوص استعمال سے بھی ظاہر ہے۔غزل کے لئے وہ نادر بحریں استعمال کرتے ہیں اور خوب مہارت سے استعمال کرتے ہیں۔ یہ خاصہ انہی کا حصّہ ہے۔حکیم منظور کی انفرادیت ان کی استعارہ سازی کی ترکیب بندی میں ہیں۔

تاہم وہ متنی طور پر استعارہ وضع نہیں کرتے' بلکہ ایک حقیقی فنکار کی طرح ان کا انداز بیان بھی استعاراتی ہے۔محمود ہاشمی لکھتے ہیں:

''اس عہد کی غزل کو جس بحر اضطراب اور خاموشی سے الفاظ تک
نو کرنے والی مفہوم کی تہہ دار تلوار کی ضرورت ہے۔وہ سب کچھ
حکیم منظور کے استعارہ کا سرمایہ ہے۔'' ۱۴ے

الفاظ تو زبان کے آلات ہیں اور انہیں کے سہارے یہ اپنے مقاصد حاصل کرتی ہے۔ انہی الفاظ کی الٹ پھیر سے یہ بسا اوقات دل کی حقیقت چھپا لیتی ہے۔گویا زبان دل کی حقیقت کو چھپا لیتی ہے اور دل کے خوشگوار خیالات کے لئے الفاظ کے گورکھ دھندوں میں پناہ لیتی ہے' لیکن اگر دل زبان کی بالا دستی قبول کرنے سے انکار کرے تو اس کی آنکھ مچولی کی کوئی ضرورت نہیں۔

شاید یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ حقیقی شاعری کا آغاز' انبساط اور خوشی سے ہونا چاہیے اور اس کا اختتام بصیرت پر ہو۔حکیم منظور کی شاعری میں کئی مقامات ایسے آتے ہیں جنھیں اس ادبی سچائی کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

صورت زنجیر ہوں اپنا اسیر
سلسلہ در سلسلہ در سلسلہ''

گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

''ان کی آواز بیک وقت جانی پہچانی بھی ہے اور اجنبی بھی' ان کا

ہنراس میں ہے، کہ وہ بظاہر سادہ گو معلوم ہوتے ہیں لیکن یہ باتیں

تہہ داری اور معنی آفرینی کا حق بھی ادا کر جاتے ہیں۔''   ۱۵؎

حکیم منظور کی شاعری میں فکر، تجربے اور احساس کے اظہار کی ایک انفرادیت ہے، کہ وہ راہ عام سے ہٹ کر چلنے کے عادی ہے۔ ان کو رسمی خیالات کا روایتی انداز سے ابلاغ پسند نہیں کرتا یہی وجہ ہے، کہ حکیم منظور کے کلام میں واقع سنجی اور معنی آفرینی نمایاں ہے۔

خواجہ ثناء اللہ بٹ:۔ ۱۴ نومبر ۱۹۲۲ء کو سرینگر میں پیدا ہوئے۔ میٹرک کا امتحان ۱۹۳۸ء میں پاس کر کے اپنا آبائی پیشے (تجارت) کو اپنایا۔ لیکن قدرت نے جوان کی فطرت کو کسی اور شعبے کے لئے تیار کیا تھا اس میں قدم ڈالا یعنی صحافت۔ خواجہ ثناء اللہ بٹ نے اسی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ چنانچہ ۱۹۵۲ء میں آپ نے مظفر آباد سے ہفت روزہ ''کشمیر'' نکالا۔ جو نہایت ہی بے لاگ تھا۔ اس اخبار کی بے لاگ حقیقت نگاری اُس وقت کے ارباب اقتدار کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگی۔ نتیجے کے طور پر بقول جان محمد آزاد:

''اخبار مارچ ۱۹۵۷ء میں آپ کو اپنے دیگر رفقاء سمیت گرفتار کیا

گیا۔ بعد میں پاکستان کی سلح خونی نے آپ کو حد متاثر جنگ کے

اس طرف اپنے آبائی وطن دھکیل دیا۔''   ۱۶؎

اپنے آبائی وطن پہنچنے پر ثناء اللہ بٹ نے ''آفتاب'' نام کا اخبار نکالا۔ جو پہلے بقول ڈاکٹر جوہر قدوسیؔ کے 'جون ۱۹۵۷ء میں ہفتہ روزہ کی شکل میں سامنے آیا۔ چند ماہ کے بعد یکم

جنوری ۱۹۵۸ء سے آفتاب روزنامہ کی صورت میں شائع ہونے لگا۔

یہ روزنامہ آج تک باقاعدگی کے ساتھ شائع ہورہا ہے اوراپنی اشاعت کی اس طویل ترین تاریخ کے بلند وپست شب وروز میں بلاشبہ یہ روزنامہ عوام کے دل کی دھڑکن بن گیا ہے۔ڈاکٹر جوہرقدوسیؔ لکھتے ہیں:

''ترقی واستحکام کے اس تیز ترین عمل کے پس پردہ جوعوامل کارفرما تھے ان میں ثناء اللہ بٹ پہلے اخبارنویس ہے۔جنھوں نے اس زمانے میں اخبارکوعوام کا اخبار بنانے کی کوشش کی۔اب تک کوئی اخبارنویس اخباروں کی اشاعت بڑھانے کی طرف بالکل توجہ نہیں دیتا تھا۔ثناء اللہ بٹ نے اس رجحان کوختم کردیا۔'' ۱۷؎

غالباً ۳۵۔۴۰ برس قبل ثناء اللہ بٹ نے روزنامہ آفتاب کی شکل میں جو پودا لگایا تھا' آج وہ ایک تناور درخت کی شکل میں موجود ہے' جس کی چھاؤں میں وادی کے بے شمار ادیبوں اورقلمکاروں کوپھلنے پھولنے کا موقعہ ملا۔اس کے علاوہ یہ روزنامہ قارئین کے مطالعے میں ہمیشہ خاطرخواہ اضافے کی شکل میں رہا۔دراصل ثناء اللہ بٹ نے اخبارنویسی کے کچھ ایسے تجربے کئے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے نادر' جدّت پسند اورلائق ستائش تھے۔اس ضمن میں ڈاکٹر جوہرقدوسیؔ لکھتے ہیں:

''ان کا نظریہ یہ تھا کہ وہ اخبار اخبار کہلانے کے مستحق نہیں' جوعوام

> کے سامنے نہ آئے ۔۔۔۔۔وہ اخبار نویسی میں نئے نئے تجربے
> کرنے لگے۔انھوں نے کچھ روایتیں قائم کیں۔آفتاب کے نئے
> تجربوں سے اس کی اشاعت میں کافی اضافہ ہوا' لیکن اس کے
> کچھ تجربے اخلاقی نقطہ نظر سے اچھے نہیں تھے۔'' ۱۸؎

اس طویل دور میں ایسے حالات بھی پیدا ہوئے' جب روزنامہ'' آفتاب'' پر مختلف مکتب فکر نے اپنی اپنی صلیبیں چسپاں کرنے کی کوشش کی، لیکن خواجہ صاحب نے ایک معقول صحافی کی حیثیت سے ان اشتعال انگیزیوں کا بھرپور مقابلہ کیا۔تاریخ کے اس تاریک ترین ادوار میں اس جرات رندانہ کا مظاہرہ کرنا آپ کا ہی حصّہ ہے۔خواجہ ثناءاللہ بٹ کو بلا شبہ بقول جان محمد آزاد کے ریاست جموں وکشمیر میں صحافت کا trend setter قرار دیا جا سکتا ہے۔

ثنا اللہ بٹ کو زباں وبیاں پر ملکہ حاصل تھا' جس کا اندازہ ان بے لاگ تبصروں سے لگایا جا سکتا ہے۔اس نے بڑے بڑوں کو متاثر کیا' جس میں سیاسی، سماجی، اخلاقی، اقتصادی غرض ہر طبقہ اشراف شامل ہیں۔روزنامہ'' آفتاب'' کی اس ہمیت کو دیکھتے ہوئے محمد یوسف ٹینگ یہ لکھنے پر مجبور ہوئے:

> '' آفتاب نے کشمیر کی صحافت کو بہت سے نئے سنگ میل طے
> کرائے' اتنے بڑے سائز اور ہجوم میں اپنے نستعلیق، خوش خط اور
> صاف وشفاف گیٹپ میں شائع ہونے والا یہ پہلا کشمیری

روز نامہ ہے اور اپنی طباعت اور کتابت کے لحاظ سے یہ صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ پاکستان کے بہترین اردو روز ناموں میں شمار کیا جاسکتا ہے، جو ہر صبح ایک نئی نویلی دلہن کی طرح آراستہ و پیراستہ ہوکر سرینگر کے قارئین کو اپنی صباحت سے محظوظ کرتا ہے۔ اس نے کشمیر کی صحافت میں سب سے پہلے آفسیٹ کی نئی ٹکنالوجی استعمال کی اور اس کو ایک عظیم انقلاب سے آشنا کر دیا۔ ۔۔۔۔ اس کے کالم ''پھول اور کانٹے'' میں صحافتی مزاج کے اچھے نمونے پیش ہوئے کبھی کبھار اس میں ادبی، تحقیقی، مضامین اس پائے کے شائع ہوئے کہ انھیں کشمیر کے کسی بھی علمی تذکرے اور تبصرے میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اس کا معرکتہ آراء کالم ''خضر سوچتا ہے ولّر کے کنارے'' ایک کلاسیکیت کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔'' ۱۹؎

خواجہ ثناء اللہ بٹ ایک منفرد اور معقول صحافی ہونے کے علاوہ ایک اچھے محقق بھی تھے۔ آپ نے کشمیر کی تیس سالہ سیاسی تاریخ کے واقعات بھی قلمبند کئے ہیں، جو کشمیر ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۷ء تک کی کتابی صورت میں ہمارے سامنے ہیں اس کتاب میں مختلف امور پر سیر حاصل بحث ملتی ہے، جیسے ۱۹۵۳ء کا خونی انقلاب، آزاد کشمیر میں مسعلہ بغاوت، کشمیر سازش کیس، وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔ اس سے ان کے کھرے، دوٹوک انداز اور ایک سچے محقق کی

غیر جانبدارانہ شخصیت سامنے آتی ہے۔

پروفیسر محمد زماں آزدہ: ۔مرزا محمد زماں آزردہ ۲۵ دسمبر ۱۹۴۴ءکو سرینگر میں پیدا ہوئے۔ ابتداء ہی سے پڑھنے لکھنے کے بڑے شوقین تھے۔ اپنی ادبی زندگی کے آغاز کے سلسلہ میں خود رقمطراز ہیں:

''۱۹۶۲ء کے دوران میں ایک ہیلتھ اسکیم کے تحت حاجن سینٹر میں کام کرتا تھا۔ اس زمانے میں لکھنے پڑھنے کا شوق بے پناہ تھا وہاں وقت بھی کافی ملتا تھا۔ایک ناول لکھنے لگا کوئی ڈیڑھ سو صفحات اس کے مکمل ہو چکے تھے' پھر ایک دن اس سینٹر کے انچارج ڈاکٹر نے میرے اس مسودے کو دیکھا ظاہر ہے' کہ سترّہ برس کی عمر میں میرا مطالعہ محدود رہا ہوگا۔'' ۲۰ ؎

ابتدائی تعلیم کے بعد کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے ایم۔اے امتیاز کے ساتھ پاس کیا اور اس کے بعد ۱۹۷۸ء میں پروفیسر شکیل الرحمن اعظمی کے زیر نگرانی اپنا پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ بعنوان ''مرزا سلامت علی دبیر کی حیات اور افکار'' مکمل کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے اس تحقیقی کام کو ادبی حلقوں میں کافی پزیرائی حاصل ہوئی اور انھیں اتر پردیش، آندھرا اور مغربی بنگال کی اردو اکیڈمیوں نے انعام سے نوازا۔اس سلسلہ میں ایک بیان جان محمد آزاد کا ملاحظہ ہو:

''۔۔۔ پھر ۱۹۷۷ء میں ''مرزا سلامت علی دبیر کی حیات اور

> افکار'' پر اپنا تحقیقی پروجکٹ مکمل کیا۔ اور پی ۔ ایچ ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی ۔مرزا دبیر پر اپنے تحقیقی کام کے سلسلہ میں زماں صاحب متعدد بار لکھنو آتے جاتے رہے اور یہاں کے مقتدر ارباب سخن سے ادبی اور تحقیقی مسائل پر باہمی تبادلہ خیال کرتے رہے۔ دراصل وہ سو فیصد پکی شہادت کے بغیر کوئی بات تسلیم نہیں کرتے۔'' ۲۱؎

محمد زماں آزردہ نے جیسی کارگردوگی تحقیق کے میدان میں دیکھائی ویسی ہی' انہوں نے تخلیق کے میدان میں پیش کیں۔تخلیقی ادب کے سلسلے میں ان کی پہلی کڑی ''غبار خیال'' کی صورت میں ہے۔ یہ انشائیوں پر مشتمل مجموعہ ہے جو ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے شکیل الرحمن اعظمی لکھتے ہیں :

> ''اس کتاب کے مصنف نے اپنی سوچ اور اپنے ذہن کے ساتھ اسلوب کے ہر منزل کی تراش خراش کی ہے ۔ دراصل یہ کتاب اوریجنل تخلیق کار کے فکر وفن کا ابتدائی میزان ہے جس میں جگہ جگہ چبتے ہوئے طنز اس بات کا گویا عندیہ ہے کہ ایک زیرک اور بے ریا کردار ادب کی محفل میں وارد ہو رہا ہے۔'' ۲۲؎

پروفیسر محمد زماں آزردہ کی دوسری تخلیق ''شیرین کے خطوط'' ہے۔ یہ دسمبر ۱۹۷۴ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب ناول یا افسانہ نہیں بلکہ انشائیہ نما مکاتب ہے یا یوں کہا جائے مکتوب

زاد انشائیے ہیں۔ ان میں زمانی فضا بھی ہے اور ترقی پسند رنگ بھی اس کتاب کے بارے میں پروفیسر زماں آزردہ خود لکھتے ہیں:

''۔۔۔ چنانچہ ایک خواہش پیدا ہوئی کہ خطوط کی صورت میں ایک کتاب لکھی جائے۔ ویسے خط لکھنے کا موقع مجھے اس وقت سے ملا تھا جب میں صرف آٹھ برس کا تھا۔ والد صاحب ریاست سے باہر رہا کرتے تھے میں گھر میں بڑا لڑکا تھا میرے بڑے بھائی کا انتقال سال پہلے امرتسر میں ہو چکا تھا اور میرے تولد کے وقت والد صاحب کی عمر ۶۵ برس تھی۔ میں باقاعدگی سے والد کے خطوط کا جواب دیتا اپنی والدہ کو پڑھ کے سناتا۔ میں ہر بار بے تکلفی سے لکھ دیتا تھا' پھر ہوتے ہوئے ۱۹۷۱ء میں روزنامہ '' چنار'' کے سنڈے ایڈیشن میں میرے مخطوط '' خطوط غم'' کے عنوان سے شائع ہوئے یہ سلسلہ جاری رہا۔لوگ اسے پسند کرنے لگے۔ ۔۔'' ۲۳؎

پروفیسر محمد زماں آزردہ کا یہ نثری نخلستان شاداب و روشن ہے۔ ان کے یہاں لطافت بھی ہے' ملائمت و خوش مزاجی بھی' ان کے جتنے بھی انشائیہ شائع ہوئے ان میں سماج کی تلخیوں کا ہلکا بوجھ بھی ہے۔ ذوق سلیم اور احساس حسن کا نیا معیار بھی ہے۔ ۱۹۷۳ء سے ۱۹۸۲ء کے درمیان ان کے ایک انشائیوں کا انتخاب شائع ہوا' جس کا جائزہ پیش کرتے ہوئے ممتاز

ناقد قمر رئیس لکھتے ہیں:

''زماں صاحب کی شوق طبع ہنساتی ہی نہیں ایسی چٹکیاں بھی لیتی ہیں کہ آدمی بلبلہ اُٹھتا ہے زماں صاحب کے ظریفانہ انشائیوں میں ان کا منفرد انداز صاف جھلکتا نظر آتا ہے۔'' ۲۴ ؎

پروفیسر محمد زماں آزردہ کا فن خوش مزاجی اور بذلہ سنجی کی ایک مثال ہے۔شیریں اور باوقار طرز ادا کے ساتھ لطیفوں کی پھُل جھڑیاں چھیڑتے ہیں' جو بزم باغ کو بزم بہار کی تاثیر عطا کرتے ہیں۔ ہمارے یہاں ڈاکٹر محمد آزردہ نے انشایئے کے صنف میں کئی مستحسن کوششیں کی ہیں۔ان کے یہاں انشائیہ تحریر کرنے کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔حال ہی میں ان کے انشائیوں کے مجموعہ کا انگریزی میں ترجمہ کیا گیا۔ ان میں سے بعض انشایئے اس قدر اعلیٰ پائے کے ہیں کہ انھیں انگریزی کے انشائیوں کے پہلو بہ پہلو رکھا جاسکتا ہے۔

گویا کہ محمد زماں آزردہ ایک کامیاب انشائیہ نگار ہیں' جو اپنی تخلیقی کارکردگی کو دن رات محنت ولگن سے آگے بڑھانے کے خواہشمند نظر آتے ہیں اور ان کا یہ سفر ہنوز جاری وساری ہے۔

پروفیسر مجید مضمر: ۔آپ کا اصل نام عبدالمجید میر' سنہ پیدائش ۱۹۵۴ء ہے۔ زندگی کا سفر ۲۵ جولائی ۲۰۱۳ء کو اختتام پزیر ہوا' جب ایک موذی مرض کے سبب ۵۹ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔ان کے پسماندگان میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہے۔مجید مضمر ذاتی طور پر نہایت ہی حلیم الطبع ،منکسر المزاج اور کم گفتار شخص تھے۔ وہ گذشتہ پینتیس

سال سے اردو ادب بالخصوص اردو ناول، افسانوی ادب، تنقید اور اردو تاریخ کے سرچشموں سے براہ راست وابستہ تھے۔ اردو ادب نے صنف ناول وافسانہ میں جتنے سرکردہ تخلیق کار پیدا کئے ہیں، شاید ان کی کوئی تحریر ہو جو مجید مضمر کی نظر سے نہ گزری ہو۔ مجید مضمر بڑے ہی نکتہ سنج، سخن فہم اور علم دوست تھے۔ انھوں نے ریاست جموں وکشمیر میں پہلی بار اردو کے علامتی افسانے پر ایک مبسوط تحقیقی مقالہ پیش کیا۔ وہ کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں گذشتہ ۳۵ برسوں سے اردو تنقید اور فکشن کی تدریس سے براہ راست وابستہ تھے۔ جان محمد آزاد لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر محمد مجید مضمر کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ریڈر کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ اردو زبان وادب کے اس کہنہ مشق استاد نے مختلف ادوار میں مختلف انداز کی ایسی تحریر رقم کی ہے، جن کے نقوش کو مٹایا نہیں جا سکتا کیونکہ یہ تحریریں آپ کی تنقیدی بصیرت اور تخلیقی وسعت کی غماز ہیں۔'' ۲۵؎

پروفیسر مجید مضمر کی تصانیف میں اردو کا علامتی افسانہ، کشمیری ڈراما اور فکشن، شیخ نور الدین ولی، نقوش ادب اور رسالہ ''بازیافت'' شامل ہیں۔ رسالہ ''بازیافت'' کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے شائع کراتے تھے۔ اس رسالے کی اہمیت کے بارے میں جان محمد آزاد لکھتے ہیں:

''بازیافت شعبۂ اردو کا ایسا رسالہ ہے جس کی ترتیب وتہذیب

کے کام کے ساتھ آپ برسوں تک وابستہ رہے اور اسے اردو کی ترویج اور ترقی کا اہم وسیلہ بنانے میں عرق ریزی سے کام کرتے رہے ہیں۔ادبی صحافت کے ان صفحات میں آپ زبان وادب کے معاملات پر اپنے معروف اسلوب میں معقول تجزیہ پیش کرتے رہے۔'' ۲۶ ؎

پروفیسر مجید مضمر اردو فکشن پر گہری نظر رکھتے تھے۔ وہ افسانوی ادب کی شعریات کی تشکیل کی ضرورت کو شدت سے محسوس کرتے تھے۔افسانے کی شعریاتی تشکیل نہ پانے کی بنیادی وجہ ان کے نزدیک یہ تھی، کہ شاعری کے مقابلے میں افسانے کو کوئی ایسا ناقد اور محقق نہیں ملا، جس نے خود کو اس صنف کے لئے وقف رکھا ہو۔ وہ کسی خاص تنقیدی نظریے سے جٹ جانے کے روادار نہیں تھے بلکہ فن کی بحالی کے بارے میں سنجیدہ نظر آتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

''کوئی بھی تنقیدی نظریہ حتمی نہیں ہے۔ اس لئے کسی خاص نظریہ سے چمٹ جانے اور محض اسی کا اشتہار بننے کے عمل سے بالاتر ہوکر افسانے کی صنفی شناخت اور اس کے مختلف عناصر کی اہمیت کاری سے فن کے رشتے اور فن کی سماجی معنویت کے بارے میں غور وفکر کرنا لازمی ہے۔اس سلسلہ میں روایتی تنقید کے طریقے کار سے بھی اگر مدد مل سکے تو کوئی حرج نہیں۔ ساختیات اور پس ساختیات

نیز کاری اساس تنقید سے بھی اس ضمن میں مدد لی جاسکتی ہے۔''

۲۷؎

مجید مضمر کی خدمات ہمہ جہت تھی۔ وہ اردو زبان کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان کے بھی ماہر تھے۔ مجید صاحب کی یقینی مگر بے وقت موت نے اردو ادب کو نا قابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔

مرغوب بانہالی: ۔ غلام محمد المعروف مرغوب بانہالی' کشمیری اور اردو زبان کے ایک کہنہ مشق ادیب اور شاعر ہیں۔ کشمیر کے موجودہ ادبی منظر نامے پر مرغوب بانہالی کی گراں قدر شخصیت ایک ممتاز محقق صاحب طرز ترجمہ نگار' سنجیدہ عالم اور ایک صاحب طرز شاعر کی حیثیت سے اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ مرغوب صاحب ان چند تخلیق کاروں میں سے ہے۔ جنھوں نے اپنی تخلیقی توانائیوں اور شاعرانہ کاوشوں سے کشمیری شاعری کے نگارخانے سجائے ہیں۔ مرغوب صاحب نظم ونثر دونوں پر یکساں دسترس رکھتے ہیں اس رائے کی تائید ہمیں قابل قدر اقبال شناس اور دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے ایمرائٹرس پروفیسر عبدالحق کے اس اظہار اعتراف سے بھی ملتی ہے' جو انھوں نے مرغوب بانہالی کی تصنیف'' آدم گریہ اقبال'' کے دیباچے میں درج کی ہے:

''پروفیسر مرغوب بانہالی ذی علم بھی ہے اور ذی فکر بھی وہ سوچ میں سچے اور اظہار میں باعمل ہے۔ ان کے فکری موضوعات اور ذہنی مناسبات پر رشک ہوتا ہے۔ ان کے دائرہ کار کی وسعت

ان کی پروقار شخصیت کی کشادہ جبینی کی ایک مثال پیش کرتی ہے۔
ان کے فروغ نظر کی آ گاہی بھی قدر اوّل کی حیثیت رکھتی ہے۔
اردو فارسی اور کشمیری زبان وادب پر ان کی دوربین نگاہیں۔
طلبہ اور اساتذہ کی رہبری کے لئے روشنی اور راز جوئی کا حوصلہ
بخشتی ہے۔''   ۲۸؎

مرغوب بانہالی صاحب تصانیف ہے۔ یہ سلسلہ ان کے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالہ سے شروع ہوا، جس میں مرغوب نے ۱۶۳۹ء سے لے کر ۱۹۵۵ء تک تخلیق ہوئے فارسی ادب پاروں کا تنقیدی جائزہ اور کشمیر کی تین سو سالہ ثقافتی تاریخ کا جائزہ پیش کرنے کی کامیاب کوشش کر کے کشمیر یونیورسٹی سے فارسی میں پہلی پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کر کے علامہ کے اس خواب کو شرمندہ تعبیر بنا دیا ہے، جس کو تحقیقی مقالہ کی صورت میں مکمل کرنے کی خواہش علامہ اقبال نے شاعر کشمیر غلام احمد مہجور اور مورخ محمد دین فوق کے نام ایک خط میں ظاہر کی تھی۔ یہ کام انجام دے کر پروفیسر مرغوب بانہالی نے نہ صرف اپنی خوش نصیبی کا بلکہ اپنی ادبی پختہ کاری کا ایک مثالی نمونہ پیش کیا۔ پروفیسر شمس الدین احمد، مرغوب کے اس تحقیقی مقالہ کے نگراں تھے۔

پروفیسر مرغوب بانہالی ذی علم بھی ہیں۔ ان کے فکری موضوعات اور ذہنی مناسبات پر رشک ہوتا ہے۔ ان کے دائرہ کار کی وسعتیں ان کی پروقار شخصیت کی کشادہ جبینی کی ایک مثال پیش کرتی ہے۔ ان کے فروغ نظر کی آ گاہی بھی قدر اوّل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اردو،

فارسی اور کشمیری زبان وادب پر ان کی دوربین نگاہیں۔طلبہ اور اساتذہ کی رہبری کے لئے روشنی اور راز جوئی کا حوصلہ بخشتی ہے۔ان کی دیگر تصنیفات میں غالب، رساجاویدانی، سروجنی نائیڈو، قاضی نذیر اسلام، خزینہ الامین، خواجہ غلام رسول کامگار، ولی اللہ متّو، قدیم کاشر، اخلاقیات مرغوب، تجلستان، کشمیر شناسی وغیرہ پیش پیش ہیں۔

مرغوب بانہالی عصری حسیت سے مالا مال ہونے کے ساتھ ساتھ ایک پختہ فکر اور قادر کلام شاعر بھی ہیں۔ ان کے کلام میں غزل، رباعی، قطعات، گیت، آزاد نظم، پابند نظم، نثری نظم میں فن کے کامیاب تجربے کئے ہیں۔مرغوبؔ کے ابتدائی کلام میں ایک فطری سلاست اور فارسی الفاظ کی کثرت نظر آتی ہے' پھر بھی ان کے اظہار خیالات میں زبان کی شستگی اور شیرین لب و لہجے کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے۔زبان و بیان پر زبردست دسترس ہونے کے علاوہ ان کے سنجیدہ تخیل کی بلندی، ان کے مطالعہ کی وسعت اور ان کی فنکارانہ انفرادیت آپ کی شخصیت کی غماز ہے۔

ظہور الدین :۔ ظہور الدین ۱۹۴۲ء میں جموں میں پیدا ہوئے۔ ایم۔اے انگریزی اور ایم۔اے اردو کرنے کے بعد پی۔ایچ۔ڈی پروفیسر گیان چند جین کی نگرانی میں کیا۔انھوں نے اپنی طبیعت سے مناسبت رکھنے والے موضوع کو اپنے پی۔ایچ۔ڈی کے لئے چن لیا۔جس میں ان کی قبل از معلومات اور مطالعات کا خاصا عمل دخل تھا چنانچہ ایم۔ اے انگریزی کرنے کی وجہ سے ان کے یہاں انگریزی ادب پر خاصی نظر تھی' جس کی وجہ سے انہوں نے مشرق ومغرب کے نظریات کو مشترکہ طور پر لیا۔ان کا تحقیقی مقالہ

بعنوان ''بیسویں صدی کے اردو ادب میں انگریزی ادبی رجحانات'' ان کی ناقدانہ بصیرت کی مثال پیش کرتا ہے۔ یہ مقالہ ۱۹۷۸ء میں ریاستی کلچرل اکیڈیمی کی معاونت سے شائع ہوا۔ برج پریمی اس کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''(اس) مقالہ میں اردو کے ساتھ انگریزی ادب کے اہم رجحانات کو بڑی محنت سے تلاش کیا گیا ہے' ایسا کرتے ہوئے آپ نے بڑی دیدہ وری کا ثبوت دیا ہے۔ آپ نے انگریزی ماخذوں سے اپنا مواد اکھٹا کیا ہے اور پھر بیسویں صدی کے اردو ادب میں ان رجحانات کوٹٹول ٹٹول کر دریافت کیا ہے۔'' ۲۹؎

ظہورالدین کو ان کی کتاب ''محروم کی شاعری'' پر یوپی اردو اکیڈیمی سے انعام ملا۔ اس کتاب کے علاوہ ان کے علمی، تنقیدی اور ادبی مضامین ملک کے معتبر رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے بے شمار مضامین ''ریڈیو ٹاک'' ریڈیو کشمیر جموں سے نشر ہوئے ہیں۔ اردو ناول کا مستقبل' اردو ادب پر فوقیت کی چھاپ' غالب زندان میں' ادب میں ہپی ازم اسی طفیل کی چند کڑیاں ہیں۔ ظہورالدین ایک بلند پایہ محقق ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے تخلیق کار بھی ہیں۔ ریاست میں جو ۱۹۷۰ء کے بعد افسانہ نگاروں کا ایک کارواں نظر آیا' اس میں ظہورالدین صفِ اوّل میں شامل ہیں۔ یہ افسانہ نگاری کے میدان میں روایت کے انحراف کا اور نئے نئے رجحانات کے داخل کرنے کا دور تھا۔ اس نئے دبستان کے مبلغین میں ظہورالدین پیش پیش رہے ہیں۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''کینی بلز ۱۹۸۱ء'' میں شائع

ہوا۔جس پر انھیں اتر پر دیش اردو اکیڈیمی نے انعام سے نوازا۔ان کے افسانوی ادب کے حوالے سے نور شاہ لکھتے ہیں:

''ان کے تحریر کردہ افسانوں میں علامت،صحیح اور پر معنی ادراک ملتا ہے۔'' ۳۰؎

پروفیسر نصرت چودھری لکھتی ہیں:

''نئے اور علامتی افسانے کی روش کے بانیوں میں اہم نام ظہورالدین کا ہے۔ وہ ان افسانہ نگاروں میں ہے' جنھوں نے جدیدیت کے اندھے طوفان کو فوراً قبول نہیں کیا۔ بلکہ فنی اور تکنیکی سطح پر افسانوں میں کئے گئے تجربات کا گہرا تصوّر حاصل کر کے انھیں اپنے افسانوں میں برتا ہے۔انھوں نے زمانے کے انتشار واضطراب بے معنویت اور بدلتی اقدار کو فوراًافسانوں کا موضوع نہیں بنایا' بلکہ خوب سوچ سمجھ کر نئے افسانے کے فن سے گہری واقفیت اور مطابقت رکھنے کے بعد پیش کیا ہے۔انھوں نے عصری زندگی کے اضطراب بے مقصدیت اور انسانی نفسیات کے مختلف پہلوؤں کو اپنے افسانوں جیسے نجات ، بدرو، درشہوار، بیگ والا اور کینی بلز میں پیش کیا ہے ۔مثلاً نجات میں انھوں نے آج کے دور کے انسانی المیہ کو پیش کیا ہے۔سائنسی اور صنعتی ترقی نے

انسان کو جزوی خوشحالی دی ہے۔ اس نے انسان کے ذاتی اوصاف کومسخ کر دیا ہے وہ ذہنی پراگندگی اور روحانی انتشار کا شکار ہو گیا ہے۔'' ۳۱؎

ظہور الدین ادب کے مختلف گوشوں کو الگ الگ، لیکن گہری نظر سے دیکھتے ہیں۔اس ضمن میں ان کی کتاب ''جموں خطہ میں اردو زبان وادب کا ارتقاء'' قابل قدر ادبی کارنامہ ہے۔جان محمد آزاد اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اس خطہ میں اردو زبان وادب کا ارتقائ' آپ کی ایک اور مستحسن علمی کوشش ہے۔یہاں آپ نے ایک بالغ نظر نقاد کا فریضہ انجام دیتے ہوئے مختلف شعبوں کا گہری نظر سے جائزہ لیا۔''۳۲؎

ظہور الدین چند برس قبل جموں یونیورسٹی شعبۂ اردو کے صدر کی حیثیت سے ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں، لیکن اردو زبان وادب کی ترقی وترویج کے لئے برابر کام کر رہے ہیں۔

محمد یوسف ٹینگ : ۔محمد یوسف ضلع پلوامہ کے شوپیاں علاقہ میں پیدا ہوئے۔تعلیم سرینگر میں پائی۔اردو میں بی۔اے آنرس کرنے کے بعد سرکاری ملازمت سے منسلک ہوئے۔محمد یوسف ابتداء ہی سے ہونہار تھے۔طالب علمی کے زمانے میں ٹینگ بائز اسوسی ایشن شوپیاں کے صدر تھے۔انہی دنوں ٹینگ نے پنڈت نہرو اور عبدالغفار خان سے

ملاقات کی۔ سرکاری ملازمت ملنے کے باوجود ان کی دلچسپی صحافت سے رہی۔ انھوں نے ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۲ء تک محکمہ اطلاعات کے ترجمان ''تعمیر'' کے مدیر کی حیثیت سے اپنی پہچان بنالی تھی۔ یہ رسالہ دو ماہی تھا' اس نے یہاں کے بے شمار ادیبوں، شاعروں، قلمکاروں کو ایک پہچان دی۔ محمد یوسف ٹینگ نے ۱۹۶۲ء سے کلچرل اکیڈیمی کے دو ماہی رسالہ ''شیرازہ'' کی ادارت سنبھالی۔ چنانچہ ٹینگ کو صحافت کے ساتھ بے حد دلچسپی تھی۔ اس لئے ان کی کوششوں سے یہ رسالہ علمی و ادبی اعتبار سے ادبی حلقوں میں ممتاز ہوا۔ اس رسالے کی اشاعت سے ادب کے مختلف شعبوں کو فوقیت ملی' جو علمی، ادبی، تحقیقی وتنقیدی شعبوں پر انھوں نے ایک چھاپ ڈال دی۔ اس رسالے نے کئی شخصیات پر خاص شمارے شائع کئے ہیں' جن میں ڈاکٹر محی الدین قادری زورنمبر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کی قلمی اور ادبی مساعی یہیں تک محدود نہیں ہے۔ وہ کئی اخباروں کے کالم نویس رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین ملک بھر میں معتدد رسالوں میں چھپے ہیں۔ ان ہی مضامین میں سے ایک انتخاب ''کشمیری اور کشمیری ادب کے نام'' سے انہوں نے شائع کیا۔ جس میں حسب ذیل مضامین شامل ہیں۔

رسول میر، مثنوی گل ریز ترجمہ یا تخلیق، مہجور کی شاعری، کشمیری زبان اور اردو، میں غلام نبی عارض، خوشی محمد ناظر، ایک ادبی سرقہ، کشمیر کے اصلی باشندے، اقبال کی ذہنی بغاوت، مہجور کا آخری سفر، جاوید نامہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

محمد یوسف ٹینگ کا مطالعہ وسیع ہے۔ فارسی و اردو ادب پر آپ کی دسترس ہے' جس کی

وجہ سے آپ کی تنقیدی آراء اصحاب نقد کی طرح قابل قدر، جاندار اور لائق استفادہ ہے۔

جان محمد آزاد لکھتے ہیں:

''آپ ایک بالغ نظر محقق اور بے لاگ نقاد کی حیثیت سے ملک بھر میں معروف ہوئے آپ نہ صرف اردو ادب پر اپنی گہری نظر کے ثبوت فراہم کرتے رہے بلکہ آپ کی نگاہ کشمیری ادب پر بھی بہت دور تک ہے۔''۳۴؎

محمد یوسف ٹینگ کے تحقیقی وتنقیدی مضامین کا ایک اور مجموعہ ''شناخت'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس میں انیس مقالے ہیں، جو دوسو صفحات پر مشتمل ہے۔ ان مقالات میں بیشتر کا تعلق کشمیر اور کشمیری ادب سے ہے۔ مثلاً قرآن کا نسخہ فتح اللہ، علامہ اقبال کی شاعری، محمد دین فوق، غنی کاشمیری وغیرہ شامل ہیں۔ ان مضامین سے صاف ظاہر ہوتا ہے، کہ فاضل مصنف کی ناقدانہ بصیرت اور دلچسپیوں کا دائرہ کس قدر وسیع اور متنوع ہے اور کس قدر مختلف علوم پر عالمانہ نگاہ رکھتے ہیں۔ ادب تاریخ، عمرانیات، اساتیر، زبان شناسی، آثار قدیمہ اور صحافت کے موضوعات پر بلاشبہ ان کی عالمانہ مہارت مستحسن ہے۔

محمد یوسف ٹینگ کی مختلف تصانیفات کے آئینہ میں ان کی محققانہ وناقدانہ بصیرت پر تبصرہ کرتے ہوئے۔ پروفیسر رحمن راہی لکھتے ہیں:

''ادبی تعلق سے تو ٹینگ صاحب کا طلوع وظہور مسلسل عروج پذیر اور وسعت گیر رہا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب میں آفاقی شاعری کیا ہے

جاوید نامہ میں اقبال کی ذہنی بغاوت اور کشمیری شاعری میں جدید رجحانات جیسے مقالات اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ ٹینگ صاحب کی ذات بالخصوص کشمیری شاعری کو ایک حساس اور جرت مند ناقد ملا ہے۔ شناخت کا مطالعہ اس کے مصنف کی کشمیری الاصل ذات کو قارئین کے سامنے آئینہ کی طرح پیش کرتا ہے۔ ایک بات غبار خاطر بن جاتی ہے ٹینگ صاحب اپنی شخصیت کے مختلف پہلوؤں میں ہمشہ توازن برقرار نہیں رکھ پاتے ایسا ہوتا ہے کہ ان کی صحافی ذات ان کی ناقدانہ شخصیت پر غالب آجاتی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو ان کے بعض مقالات کی سرخیاں اس قدر سنسنی خیز نہ ہوتی نہ ہی وہ اپنی ندرت کا خود اعلان کرتے ٹینگ صاحب استعاراتی بیان کے بڑے رسیا معلوم ہوتے ہیں۔ بعض اوقات یہ انہیں زیب بھی دیتا ہے لیکن کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے استعارہ کو سہار انہیں پاتے چنانچہ استعارہ بکھیر کر بیان کے بکھراؤ اور کبھی کبھی اس کی ژلیدگی کا سبب بنتا ہے۔'' ۳۴؎

محمد یوسف ٹینگ کی ایک ادبی کڑی مرحوم عبدالاحد آزاد کی یادگار تصنیف ''کشمیری زبان اور شاعری'' کی ترتیب ہے۔ اس کا پہلا اور دوسرا حصّہ ٹینگ نے مقدمہ اور حواشی کے ساتھ ترتیب دیا' جسے پہلے ٹینگ کی عالمانہ نظر کہہ سکتے ہیں۔ اس کتاب کی ترتیب کے سلسلہ

میں جو مسودات ٹینگ کی نظر سے گزرے۔ ان کے حوالے سے ٹینگ کا کچھ یوں کہنا ہیں:

''اس تذکرے کے مسودات جب پہلی بار میرے دیکھنے میں آئے تو بہت خلط ملط اور بے ترتیب تھے۔ ناوقت موت نے ان پر نظر ثانی اور ان کی خاطر خواہ شیرازہ بندی کا موقع ہی نہ دیا یہ مسودات کافی ضخیم تھے اور ایک ہی جلد میں ان کا جمع کر دینا مجھے مناسب نہیں معلوم ہوا' اس لئے میں نے مرزا کمال الدین شہداء کے مشورے سے انھیں دو جلدوں میں تقسیم کر دیا ہے۔'' ۳۵؎

محمد یوسف ٹینگ نے اس کے علاوہ رسول میرؔ (جو کشمیری غزل کے امام مانے جاتے ہیں) پر ایک کتابچہ مدون کیا۔ کلچرل اکیڈیمی کے سالنامے ''ہمارا ادب'' کی اشاعت اور ترتیب میں انھوں نے اچھے خاصے تجربے کئے۔ جس کی وجہ سے ٹینگ اردو کے اچھے مرتبین میں شمار کئے جاتے تھے۔

محمد امین اندرابی:۔ محمد امین اندرابی ۸ مارچ ۱۹۴۰ء کو ملارٹہ (نوہٹہ) سرینگر کے اندرابی سادات کے ایک پروقار خاندان میں پیدا ہوائے۔ ابتدائی تعلیم اسلامی ہائی اسکول گوجوارا سرینگر سے حاصل کی۔ اس کے بعد امر سنگھ کالج سرینگر میں داخلہ لیا اور یہیں سے گریجویشن حاصل کی۔ کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد کچھ مدت کے لئے محکمہ سیاحت اور ریاستی کلچرل اکیڈیمی کی ملازمت اختیار کی۔ بعدازاں وہ اسلامی کالج آف سائنس اینڈ کامرس سرینگر کے شعبۂ اردو میں لکچرر کی حیثیت

سے تعینات ہوئے۔ جہاں ان کی بے قراری کو یک گونہ قرار آ گیا۔ اندرابی تقریباً سولہ سترہ سال درس وتدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ خوش اخلاقی، ملنساری ان کے عام اوصاف میں تھے جان محمد آزاد لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر اندرابی بڑے نستعلیق آدمی ہیں۔شریف وضع دار، مہذب اور مودب گفتگو بڑی سنجیدہ اور باوقار کرتے ہیں۔ بازاری مزاج کی انہیں ہوا بھی نہیں لگی ہے۔'' ۳۶؎

۱۹۷۹ء میں جب اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا گیا' تو اس کے پہلے ڈائریکٹر آل احمد سرور تھے۔ چنانچہ پروفیسر آل احمد سرور' ڈاکٹر محمد امین اندرابی کی عملی استعداد کا ادراک رکھتے تھے۔ اس ضمن میں انہوں نے اندرابی کو انسٹی ٹیوٹ جوائن کرنے کے لئے آمادہ کیا۔ اس طرح اندرابی ۱۹۷۹ء انسٹی ٹیوٹ کے تدریسی عملہ میں شامل ہوئے۔ اور پھر ۱۹۹۹ء تک اس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ یاد رہے کہ اس دوران انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز بھی رہے۔ انھوں نے اپنے دور نظامت میں قابل ستائش کام کیں۔ ڈاکٹر ریاض توحیدی لکھتے ہیں:

''پروفیسر محمد امین اندرابی سابق ڈائرکٹر اقبال انسٹی ٹیوٹ کا ایک نمایاں مقام ہے۔ انھوں نے انسٹی ٹیوٹ میں دوران ملازمت اقبالیات سے متعلق کئی سیمینار منعقد کروائے اور مختلف کتابیں مرتب کیں۔'' ۳۷؎

محمد امین اندرابی نے پروفیسر آل احمد سرور کی بصیرت افروز رہنمائی میں'' مخاطب اقبال کا تنقیدی مطالعہ'' کے عنوان سے قابل قدر تحقیقی وتنقیدی کام کر کے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری حاصل کی۔

پروفیسر احمد قدوس جاوید لکھتے ہیں:

''اقبال انسٹی ٹیوٹ کی خوش قسمتی تھی کہ آغاز کار میں ہی امین اندرابی اس سے وابستہ ہو گئے۔ذہانت، طباعی، دقت نظر، بین الموضوعاتی مطالعہ اور تجزیاتی طبیعت جیسے امتیازات سے تو امین صاحب متصف تھے۔امین اندرابی صاحب کی جو تحریریں موجود ہیں، وہ مختصر ہونے کے باوجود اس قدر جامع فکر انگیز اور تازہ کار ہے کہ اکثر تحریریں طویل مقالوں پر بھاری نظر آتے ہیں۔''

۳۸۔

محمد امین اندرابی کی تصنیفات میں اقبال اور غزل ۱۹۸۸ئ' اقبال اور فارسی شاعری ۱۹۸۹ء' اقبال تنقیدی جائزہ ۱۹۹۷ء شامل ہے۔اس کے علاوہ سرور کائنات صلی علیہ سلم کے ساتھ ان کی والہانہ عقیدت کے پیش نظر انہوں نے امام بوصیری کے قصیدے، بردشریف کا منظوم کشمیری ترجمہ کروایا اور اپنے ذاتی خرچ پر شائع کرا کے عاشقانہ رسول ﷺ میں تقسیم کروائے۔محمد امین اندرابی ایک ذی شعور قاری تھے' جس کو کتب بینی کا انتہائی شوق تھا۔ فارسی، اردو، انگریزی ادب کے ساتھ ساتھ اسلامیات، تاریخ، سائنس اور دیگر علوم کا بھی

بھر پور مطالعہ کرتے رہتے تھے۔اپنی زندگی کی آخری یادگار انہوں نے ہمدان انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسیڈیز کشمیر یونیورسٹی میں خطوط اقبال کی روشنی میں اقبال اورمحی الدین ابن عربی کے موضوع پر انگریزی میں بھی ایک دوخطبہ دیئے' جوان کی زندگی کی آخری یادگار رہے یہ خطبہ ان کے انتقال کے بعد ۲۰۰۳ء میں اسلامک اسٹیڈیز کے مجلّہ میں شائع ہوا۔ پروفیسر موصوف کی موت نے اہل وعیال سمیت شاگردوں، احباب وقرباء اورعلم وادب کے ہزاروں شائقین کوداغ مفارقت دے دیا۔

تسکینہ فاضل :۔تسکینہ فاضل یکم مئی ۱۹۵۵ءڈب تل سرینگر میں پیدا ہوئی۔آپ کے والد ریاست جموں وکشمیر کے برگزیدہ اور نامور کشمیری زبان کے شاعر گزرے ہیں۔ تسکینہ فاضل اسی ادبی گھرانے کی چشم و چراغ ہیں۔ادب کا ذوق انھیں اپنے خاندان خاص کر والد(فاضل کشمیری) سے ورثہ میں ملا۔تسکینہ فاضل نے ایم۔اے اردو امتیازی نمبرات سے پاس کیا اوراسی دوران اپنے تنقیدی سوچ بوجھ اورصلاحیتوں کا ثبوت فراہم کیا۔انہوں نے دو مقالے''لال عارفہ کا عارفانہ ذہن اور'' اختر الایمان کا رومانی ذہن'' تحریر کیا۔ ۱۹۸۴ء میں یونیورسٹی آف کشمیر کے شعبۂ اقبالیات سے فراق گورکھپوری پر تحقیقی مقالہ پروفیسر آل احمد سرور کی نگرانی میں مکمل کر کے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔اس مقالہ کو ادبی حلقوں میں کافی سراہا گیا۔

ڈاکٹرتسکینہ فاضل نے ۱۹۸۴ء سے ۱۹۸۹ءتک اقبال انسٹی ٹیوٹ میں ریسرچ پوسٹ کی حیثیت سے بڑی جان فشانی سے کام کیا اور ۱۹۸۹ء میں انھیں انسٹی ٹیوٹ میں بحیثیت لکچر

رمقرر کیا گیا۔علمی اور ادبی دلچسپیوں کے علاوہ تسکینہ صحافت میں بھی اپنا خوب مقام رکھتی ہیں ۔تسکینہ فاضل کوصحافت سے خاصی دلچسپی رہی ہے چنانچہ انہوں نے وادی کے معروف اردو روز نامہ ''وادی کی آواز''میں پانچ سال تک اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیئے ۔اس دوران ان کے زورقلم کو وادی کے علمی وادبی حلقوں میں خاصی پذیرائی حاصل ہوئی ۔جان محمد آزاد لکھتے ہیں :

> ''اقبال انسٹی ٹیوٹ میں تحقیقی خدمات انجام دینے کے علاوہ آپ روز نامہ'' وادی کی آواز'' سے بھی وابستہ ہیں ۔اس روزنامے میں آپ کے درجنوں مضامین شائع ہوئے ہیں جوصحافتی سطحیت سے علیحدہ اپنی ایک الگ شناخت متعین کرتے ہیں ۔'' ۳۹۔

تسکینہ فاضل کا شمار اقبالیات کے سنجیدہ فکر محققین میں ہوتا ہے۔ان کے اب تک بے شمار مقالات برصغیر کے متعدد رسائل وجرائد میں شائع ہوئے ہیں' جن میں اقبال اورقرآنی تلمیحات، اقبال کی اردو شاعری کا اشتعاراتی مطالعہ، جاوید نامہ کی روشنی میں، اقبال کا تصّورابلیس، پروفیسر یوسف سلیم چستی بحیثیت مشارق اقبال، اسد ملتانی' اقبال کے ایک اہم ہمعصر،قرآن میں ہوغوطہ زن اے مردمسلماں، اردوادب پراقبال کے اثرات، پروفیسر آل احمد سرور کی اقبالیاتی تحریریں ایک مطالعہ وغیر شامل ہیں۔اس کے علاوہ ان کی تصانیفات وتالیفات میں مطالعہ اسرارخودی ۲۰۰۰ء،اقبال اوران کے معاصرشعراءوادباء ۲۰۰۳ ،اقبال نقش ہائے رنگ رنگ ۲۰۰۴ ،اقبال اورمطالعات اقبال ۲۰۰۸ ، فاضل

کشمیری شخصیت اور شاعر ۲۰۰۲، گلدستہ فاضل (مرتب) ۲۰۰۲ ، بیاد فاضل (مرتب) ۲۰۰۳ء، فراق گورکھپوری حیات شخصیت اور کارنامے ۲۰۰۳، تسکینہ فاضل ایک بے ریا ناقد کی حیثیت سے اپنا جواب نہیں رکھتی۔ وہ ٹھوس حقائق پر اپنی تحقیق کی بنیاد رکھتی ہے۔تنقید میں غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کرتی ہیں۔ چنانچہ اپنے والد پر لکھی ہوئی کتاب ''فاضل کشمیری کی شخصیت اور شاعری'' کے پیش لفظ میں لکھتی ہیں۔اس کتاب کو میری جانب سے فاضل صاحب کے تئیں کسی عقیدت کے نذرانے پر معمور نہ کیا جائے تخلیقی فنکار کے حصّہ میں ایک وقت وہ ضرور آجاتا ہے جب اس کی شاعری اپنا دفاع آپ کرتی ہے۔ڈاکٹر بدر الدین بٹ ان کی علمی وادبی خدمات کے اعتراف میں یوں رقمطراز ہیں:

> ''گذشتہ بیس برسوں کے دوران ڈاکٹر صاحبہ نے بیسوں اقبال سیمیناروں اور علمی ودینی کانفرنسوں میں اپنے اعلیٰ پائے کے مقالات پیش کر کے سنجیدہ علمی حلقوں میں اپنا مقام حاصل کر لیا ہے۔ خاص طور پر اقبالیاتی تحقیق وتنقید میں ایک خاتون محققہ ومصنفہ کی حیثیت سے ایک لحاظ سے ان کو ایک منفرد مقام حاصل ہے۔''۴۰۔

ڈاکٹر فرید پربتی:۔ غلام نبی بٹ جو ادبی حلقوں میں فرید پربتی کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۹۶۲ء میں سرینگر میں پیدا ہوئے۔فرید نے اسلامیہ کالج سرینگر سے بی۔کام کیا اور بعد میں کشمیر یونیورسٹی سے ایم۔کام کی ڈگری حاصل کی۔فرید پربتی ابتداء سے ہی اردو ادب

کے پرستار تھے اور شعر وسخن سے غیر معمولی شغف کے باعث انھوں نے کشمیر یونیورسٹی سے ہی ایم۔اے اردو، ایم۔فل اور پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگریاں حاصل کئے۔انھوں نے ایم۔فل کے لئے خلیل الرحمن اعظمی کی تنقید نگاری پر مقالہ لکھا اور پی۔ایچ۔ڈی کے لئے انہوں نے ''شاہ حاتم دہلوی کی حیات وادبی خدمات'' پر مقالہ لکھ کر ۱۹۹۵ء میں ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری حاصل کی۔

ڈاکٹر فرید پربتی کا شمار برصغیر کے معروف شعراء میں ہوتا ہے۔انہوں نے کم عمری میں ہی مقبول عام کی سند حاصل کی۔اس بات کا اندازہ یوں بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے شعری تخلیقات یکے بعد دیگرے منظر عام پر آتے گئے جن میں ''ابر تر ۱۹۸۷'' آبِ نہاں ۱۹۹۲'' اثبات ۱۹۹۸'' فرید نامہ ۲۰۰۳'' گفتگو چاند سے 2005'' ہزار امکان ۲۰۰۷'' خبر تحیر ۲۰۰۷ شامل ہیں۔فرید پربتی کی شاعری اپنے دور کی صورت حال کی تجسیم کاری کی عمدہ مثال ہے۔جس میں ایک دردمند دل کا شخصی اظہار ہے۔حامدی کاشمیری لکھتے ہیں:

> ''فرید پربتی نئی غزل کے شاعر ہیں۔نئی غزل موجودہ دور کے بحران کی تجسیم کاری کے لئے لفظ وپیکر کے علامتی امکانات کو حتی الامکان بروئے کار لاتی ہے۔فرید پربتی نہ صرف موجودہ بحرانی صورتحال کا احساس رکھتے ہیں بلکہ وہ الفاظ کے ایمائی امکانات کی کھوج لگانے کی ضرورت کا بھی شعور رکھتے ہیں۔'' ۱۴؎

یہ شعور ان کی شاعری میں زندگی کی ناآسودگی اور حال ومستقبل کی بے یقینی کا تجزیہ

کرواتی ہے جس میں تجربے کی لرزیدہ دستک کاری کے دل میں داخل ہو کر ہیجانی کیفیت پیدا کرنے کی ساوی قوت رکھتی ہے۔ پریمی رومانی لکھتے ہیں:

''فرید پربتی ایک نوآموز شاعر ہے۔ ان کی غزلیں حسن وتازگی سے معمور ہے۔ ان کی غزلوں میں وہی درد، کسک، فرد کی محرومی، موجودہ زمانے کا آشوب اور تڑپ اور گداختگی پائی جاتی ہے۔''

۴۲ ؎

فرید پربتی اپنی شاعری میں منفرد طرز ادا کے لئے بھی مشہور ہے الفاظ کا انتخاب طرز ادا لب ولہجہ، زبان کی فصاحت و بلاغت ان کے شعری سرمایہ کی خاص پہچان ہے۔ بلراج کومل لکھتے ہیں:

''فرید پربتی کا مزاج کلاسکی اور تہذیبی عناصر سے متاثر ہے زبان کے استعمال میں بھی آپ بڑے نظم وضبط سے کام لیتے ہیں۔''

۴۳ ؎

قاضی عبدالرحمن ہاشمی لکھتے ہیں:

''فرید پربتی جن اوصاف وخصوصیات کے سبب اس عہد میں اپنا امتیاز قائم کرتے ہیں وہ ان کا پختہ لسانی شعور، استعارہ سازی اور تمثیل سازی کا رجحان ہے' جو ان کی اصل پہچان کا ذریعہ بنتا ہے۔'' ۴۴ ؎

شعروشاعری خصوصاً رباعی پر اپنی گہرے نقوش چھوڑنے کے علاوہ ڈاکٹر فرید نثر میں بھی اپنا خوب مقام رکھتے ہیں۔ ان کے تنقیدی مقالات ملک کے معتبر رسائل وجرائد میں چھپ چکے ہیں۔علاوہ ازیں فرید پربتی نے شہ زور کشمیری کی ادبی وشعری خدمات پر ۱۹۹۲ء میں تحقیقی مقالہ لکھا۔اس کے علاوہ ان کے تنقیدی مقالات کا مجموعہ''انتقادواصلاح'' کے نام سے ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا۔مقدمہ فن رباعی کے عنوان سے ان کی رباعیوں پر ایک مبسوط کتاب ۲۰۰۷ء میں منظرعام پر آ گئی' جواس موضوع پر اولین کاوِش ہے۔ان کی نثری خدمات پرتبصرہ کرتے ہوئے جان محمد آزاد لکھتے ہیں:

> ''فرید پربتی ایک نوجوان محقق ،تنقید نگار اور صاحب طرز شاعر ہیں۔ انھوں نے بڑے کم وقت میں اپنی مطانت اور سنجیدگی کا احساس دِلایا۔شہ زور کشمیری پر ان کی کتاب شائع ہو چکی ہے۔ شاہ حاتم دہلوی پر ان کے پی۔ایچ۔ڈی کے مقالہ کو ممتحین اور محققین نے سراہایا ہے۔'' ۴۵؎

الغرض فرید پربتی کی ناوقت موت نے ادبی دنیا میں ایک خلیج پیدا کی اور اردو ادب کی دنیا ایک سورما سے خالی ہوگئی۔

پریمی رومانی:۔سبھاش چندر آئمہ جوادبی دنیا میں پریمی رومانی کے نام سے مشہور ہے۔سرینگر کے ایک اہل علم پنڈت گھرانے میں ان کی پیدائش ۴مارچ ۱۹۵۳ءکو ہوئی۔ان کے والد ڈاکٹر برج پریمی تھے جو اردو اور کشمیری زبان کے ممتاز افسانہ نگار ومحقق

گزرے ہیں۔جگن ناتھ آزاد پریمی رومانی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''پریمی رومانی کی یہ خوش نصیبی ہے کہ انہوں نے ایک عالم باپ کے گھر میں جنم لیا۔بچپن سے لڑکپن تک کا حصّہ عمر کا ایک حصّہ ہوتا ہے کہ گھر میں بات چیت ہی کے دوران میں لڑکا عالم باپ سے جو کچھ سنتا ہے وہ غیر شعوری اور تحت الشعوری طور پر اس کے اپنے علم کا حصّہ بنتا چلا جاتا ہے۔'' ۴۶؎

چنانچہ کشمیر میں پنڈت گھرانے ابتداء ہی سے علم وفضل کے لئے مانے جاتے تھے۔پریمی رومانی نے ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کی۔ایم۔اے اردو اور ایم۔فل کی ڈگریاں کشمیر یونیورسٹی سے حاصل کیں اور بعد میں پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری جموں یونیورسٹی سے حاصل کی۔پریمی رومانی ایک منجھے ہوئے ناقد کی حیثیت سے ادب میں اپنا بلند مقام رکھتے ہیں۔ان کی کتاب ''جدید اردو شاعری چند مطالعہ'' کو ملک بھر میں سراہا گیا ہے یہ کتاب جدید شعراء کے انفرادی مطالعوں پر مبنی ہے۔عالم خوندمیری لکھتے ہیں:

''پریمی رومانی کشمیر کے ایک ابھرتے ہوئے نوجوان ناقد ادب ہیں۔ان کے مضامین کا مجموعہ ''جدید اردو شاعری چند مطالعے'' ان کے ذوق سلیم اور تنقیدی شعور کے عمدہ نمونے فراہم کرتا ہے۔پریمی رومانی اردو شاعری کے مزاج سے آشنا ہیں اور مجھے خوشی ہے کہ وہ عصری ادب اور نئے ادب کے فرق وامتیاز سے واقف

ہے'' ۴۷؎

اس کتاب میں دس شاعروں کے مطالعے پیش کئے گئے ہیں جن میں خلیل الرحمن، بلراج کومل، مخمور سعدی، شہر یار اور حامدی کاشمیری بھی شامل ہیں۔ جان محمد آزاد لکھتے ہیں:

''پریمی رومانی جدید شاعری کے ایک اچھے پارکھ ہیں۔ان کے اسلوب میں ایک شیفتگی ہے اور انہوں نے نقد نظر میں نہایت اعتدال، احتیاط اور عزم سے کام لیا ہے۔'' ۴۸؎

پریمی رومانی ایک باصلاحیت قلمکار ہیں۔ان کے انداز نقد میں ترقی اور اصلاح کی بھی گنجائش ہے۔لیکن اپنی انفرادیت بھی رکھتا ہے۔ پریمی رومانی نہایت ہی شستہ اور شگفتہ ادبی نثر لکھتے ہیں' جس سے ان کی تنقید میں اعتدال اور توازن برقرار ہیں۔ وہ کسی فنکار یا فن پارہ پر رائے زنی کرتے وقت نہایت ہی عزم اور احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ وہ اپنی رائے نہیں لادتے بلکہ موضوع کا اس کی عمدہ گی سے تجزیہ کر کے ٹھوس حقائق سے اس کی ترجمانی کرتے ہیں۔ پریمی رومانی تنقید میں غیر جانبداری کا طرز رواں رکھتے ہیں۔ جہاں فن کی کسوٹی پر کسی نظم یا شاعر کو پورا نہیں پاتے وہاں بے باکی سے انگلی بھی دھرتے ہیں وہ کسی ادبی گروپ کے شکار نہیں ہوتے بلکہ صرف خود کو ادبی اقتدار سے پیوست رکھتے ہیں۔ زبیر ضوی لکھتے ہیں:

''پریمی رومانی کے تنقیدی رویے اور احتساب کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے' کہ وہ نئ تنقید جسے سلیم احمد فاروقی، باقر مہدی، وارث علوی اور وحید اختر نے فروغ دیا۔ اس کے گرویدہ

نظر آتے ہیں۔''۴۹۔

پر یمی رومانی کے تنقیدی مضامین پر مشتمل ایک اور کتاب ''اوراق'' کے نام سے منظر عام پر آ چکی ہے۔ اس کتاب کے بارے میں جان محمد آزاد لکھتے ہیں:

> ''اوراق پر یمی کے تنقیدی مضامین کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے جوشؔ سے لے کر طالب کاشمیریؔ، وزیر آغاؔ اور شہر یارؔ تک متعدد شعراء کے فکر وفن پر اظہار خیال کیا ہے۔ ان مضامین میں ان کی شاعری کے نئے خدوخال اور نئی وسعتوں کو اجاگر کرنے کی ایک مستحسن کوشش کی گئی ہے۔مصنف نے اپنی تشریحات کو مناسب ذیلی حوالوں کیساتھ ثابت کیا ہے۔'' ۵۰۔

اس کے علاوہ ان کی کتابوں میں اقبال اور جدید شاعری، تاثرات ،ردعمل اپنی انفرادی نقد ونظر کے اعتبار سے مستحسن ہے۔

مشتاق احمد گنّائی:۔مشتاق احمد گنّائی ۱۹۶۳ء میں سیر سوپور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے بعد ۱۹۸۶ء میں گورنمنٹ ڈگری کالج سوپور سے گریجویشن کی۔ اس کے بعد ایم۔اے عربک کشمیر یونیورسٹی سے کی۔اس کے بعد مشتاق احمد گنّائی درس و تدریس سے وابستہ ہوئے، جیسا کہ ان کا تقرر بحیثیت لکچرر اسلامیہ کالج سوپور میں ہوا۔مشتاق احمد گنّائی کے علم وادب نے انھیں درس وتدریس میں ٹکنے نہ دیا۔انہوں نے ۱۹۹۶ء میں کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اقبالیات میں داخلہ لے کر ایم۔فل کی ڈگری پروفیسر محمد امین اندرابی کی

نگرانی میں حاصل کی۔ان کے ایم۔فل کا موضوع بعنوان ''تشکیل جدید الهیات اسلامیہ'' کو اقبال انسٹی ٹیوٹ نے کتابی شکل دے کر شائع کرایا اور اس میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا پیش لفظ اور پروفیسر بشیر احمد نحوی کی تقریظ بھی شامل ہے۔اس کے بعد مشتاق احمد نے فلسفہ اقبال میں اجتہاد کی اہمیت کے موضوع پر اقبال انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر پروفیسر نحوی کی نگرانی میں تحقیقی مقالہ لکھا' جس پر انہیں ۲۰۰۲ء میں اقبالیات کے شعبۂ کشمیر یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف فلاسفی کی سند عطا کی گئی۔مشتاق احمد نے بعد میں اس مقالہ میں مزید حاضافہ کرنے کے بعد'' نظر اجتہاد اور اقبال'' کے نام سے ۲۰۰۳ء میں زیور طباعت سے آراستہ کیا۔ ہندو پاک کے ماہرین اقبالیات نے اس کتاب پر انتہائی حوصلہ افزا تبصرے شائع کئے اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن اقبال اکیڈیمی لاہور پاکستان سے طبع ہوا' جس سے اس کتاب کی اہمیت وافادیت کا با آسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ان کی دیگر تصانیفات میں اقبال عشق رسول کے آئینہ میں،نالہ نیم شب اور ایک انگریزی کتاب علامہ اقبال دابیکان آف لائٹ(Allama Iqbal-The Beacon of Light) مشتاق احمد کی ایک اور کتاب ''اقبال خصوصی مطالعہ'' کوڈائرکٹریٹ آف ڈسٹینس ایجوکیشن کشمیر یونیورسٹی نے پوسٹ گریجویٹ سطح پر شامل نصاب کیا ہے۔ان کے علاوہ مشتاق احمد کے تحقیقی مقالات اعلیٰ درجہ کے مجلّات مثلاً اقبالیات (پاکستان)اقبالیات،اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی تحقیقات اسلامی (علی گڑھ ایوان اردو (دہلی) زندگی نو (دہلی) بامن (ایران) نوید سحر (جاپان) شیرازہ (سرینگر) بازیافت،شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی سے چھپتے رہے ہیں اور یہ

سلسلہ ہنوز جاری وساری ہے۔

حوالہ جات

۱؎: بحوالہ ماہنامہ شاعر ممبئی گوشہ حامدی کاشمیری ۱۹۸۵ءء
۲؎: جموں کشمیر کے اردو افسانہ نگار از نور شاہ ص ۶۲
۳؎: ایضاً۔۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً
۴؎: اردو تنقید و تحقیق: ڈاکٹر برج پریمی تعمیر اگست ۱۹۸۳ء ص ۶۸
۵؎: بحوالہ ریاست جموں و کشمیر میں اردو از حامدی ص ۲۹
۶؎: بحوالہ رسالہ آج کل ۲۰۱۲ء ص ۷
۷؎: ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً
۸؎: ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص ۸
۹؎: ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً
۱۰؎: ریاست جموں و کشمیر میں اردو صحافت کا رول ۱۹۴۷ء از ڈاکٹر جوہر قدوسی ص ۹۳
۱۱؎: بحوالہ رسالہ آجکل ۲۰۱۲ء ص ۹
۱۲؎: ساتویں در کا شاعر۔۔۔حکیم منظور از نکہت فاروق نظر ص ۶۷
۱۳؎: بحوالہ شیرازہ جلد ۴۳ شمارہ ۶۔۸ دوسرا ایڈیشن ص ۱۴۱

۱۴۔:ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً
۱۵۔:ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔ص ۱۴۲
۱۶۔:جموں کشمیر کے اردو مصنفین از جان محمد آزاد ص ۱۲۶
۱۷۔:ریاست جموں وکشمیر میں اردو صحافت کا رول ۱۹۴۷ء از ڈاکٹر جوہر قدوسی ص ۹۰
۱۸۔:ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً
۱۹۔:مضمون: کشمیر کی صحافت کا آفتاب ''روزنامہ آفتاب'' ۱۲ مئی ۱۹۸۱ء
۲۰۔:شریں کے خطوط از محمد زماں آزردہ پیش لفظ
۲۱۔:جموں وکشمیر کے اردو مصنفین از جان محمد آزاد ص ۱۹۴
۲۲۔:ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً ص ۱۹۵
۲۳۔:شرین کے خطوط از زماں آزردہ ص ۴
۲۴۔:جموں وکشمیر کے اردو مصنفین از جان محمد آزاد ص ۱۹۷
۲۵۔:جموں کشمیر کے اردو مصنفین از جان محمد آزاد ص ۳۷۸
۲۶۔:ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔ایضاً
۲۷۔:بحوالہ رنگ رنگ باتیں کریں از مجید مضمر ص ۲۱
۲۸۔:آدم گری اقبال از مرغوب بانہالی ص ۵
۲۹۔:جموں کشمیر کے اردو مصنفین از جان محمد آزاد ص ۴۷۸
۳۰۔:ریاست جموں کشمیر کے اردو افسانہ نگار از نور شاہ ص ۸۱
۳۱۔:جموں وکشمیر کے اردو مصنفین از جان محمد آزاد ص ۴۷۹
۳۲۔:ایضاً۔۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔ص ۴۸۰
۳۳۔:ایضاً۔۔۔۔۔۔۔یضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص ۴۰۔۱۳۹
۳۴۔:شیرازہ نومبر ۱۹۸۹ ص ۱۳۱
۳۵۔:کشمیر میں اردو از پروفیسر عبدالقادر سروری ص ۳۱۸
۳۶۔:جموں کشمیر کے اردو مصنفین از جان محمد آزاد ص ۲۵۷
۳۷۔:بحوالہ جہان اقبال از ریاض توحیدی ص ۱۵۲
۳۸۔:جامعہ کشمیر اور اقبالیات از بدرالدین بٹ ص ۵۱۲
۳۹۔:جموں کشمیر کے اردو مصنفین از جان محمد آزاد ص ۶۴۔۳۶۳
۴۰۔:جامعہ کشمیر اور اقبالیات از بدرالدین بٹ ص ۵۲۱
۴۱۔:رسالہ شاعر ممبئی دسمبر ۲۰۰۵ء ص ۹
۴۲۔:ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص ۱۰
۴۳۔:ایضاً۔۔۔۔۔ایضاً۔۔ایضاً
۴۴۔:رسالہ شاعر ممبی جولائی ۲۰۰۷ ص ۱۱

۴۵ ۔: ایضاً۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔ص ۱۱
۴۶ ۔: ایضاً۔ایضاً۔۔۔۔۔ ص ۹
۴۷ ۔: رسالہ شاعر ممبی جولائی ۲۰۰۷ ص ۷
۴۸ ۔: جموں کشمیر کے اردو مصنفین از جان محمد آزاد ص ۳۷۶
۴۹ ۔: رسالہ شاعر ممبئی جولائی ۲۰۰۷ء ص ۱۲
۵۰ ۔: جموں کشمیر کے اردو مصنفین از جان محمد آزاد ص ۳۷۷

باب چہارم

بشیر احمد نحوی کی علمی و ادبی خدمات

ریاست جموں و کشمیر کا خطہ زمانہ قدیم ہی سے علم و ادب کا مرکز رہا ہے۔ یہاں کی ذہنی

زرخیزی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس سرزمین سے ایسی بے شمار تاریخ ساز شخصیتیں اٹھی ہیں۔ جنہوں نے عالمی پیمانے پر اپنی پہچان بنالی اور شہرت کے دربار میں بقائے دوام حاصل کیا۔ وادی کشمیر کے ضلع اسلام آباد (اننت ناگ) کے تاریخی قصبے بجبہاڑہ میں نحویوں کا علمی و ادبی گھرانہ ہے، جو گزشتہ دو صدیوں سے علم و ادب اور تبلیغ دین کا کام بخوبی انجام دے رہا ہے۔ بشیر احمد نحوی اسی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے والد مرحوم خواجہ غلام حسن نحوی اپنے دور کے ممتاز مدرس اور مبلغ دین تھے۔ جن کے بارے میں ڈاکٹر پیر نصیر احمد لکھتے ہیں:

''خواجہ غلام حسن نحوی مرحوم بجبہاڑہ اسلام آباد کے ایک عظیم علمی و ادبی گھرانے کے ایک ایسے چشم و چراغ تھے، جنہیں بیک وقت عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں پر ایسی مہارت تامہ حاصل تھی کہ وہ کشمیری زبان کے علاوہ عربی اور فارسی میں طبع آزمائی کرتے تھے۔'' ۱؎

سید مجید اندرابی لکھتے ہیں:

''نحوی صاحب (یعنی بشیر احمد کے نحوی) کے والد خواجہ غلام حسن نحوی، جو بظاہر عمر طبعی کی آخری منزل میں ہیں، ایک عالم دین ہونے کے علاوہ اردو فارسی و علوم شرقیہ کے جید استاد بھی ہیں۔ وہ پوری زندگی تعلیم و تعلم کے ساتھ صرف کرتے رہے''۔ ۲؎

بشیر احمد نحوی کی شخصیت اسی علمی و ادبی ماحول میں نشو و نما پاتی رہی اور پروان چڑھتی رہی۔ بشیر احمد نحوی کو علم و ادب اور خزینہ افکار و احوال کی کنجیاں وراثت میں ملیں۔ چنانچہ خون میں رچا بسا ادبی مذاق شباب کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی اپنا پرتو دکھانے لگا۔ سید مجید اندرابی لکھتے ہیں:

''چونکہ نحوی کا شجرہ نسب بجبہاڑہ کے اس خاندان کے ساتھ منسلک ہے۔ جو گزشتہ صدی کے ربع آخر سے دور حاضر تک علم و ادب پر حاوی رہا۔ میری مراد نحوی خاندان کے اسلاف سے ہے، جن کے ہاتھوں میں خزینہ افکار و اعمال کی کنجیاں تھیں۔ ظاہر ہے کہ نحوی کی ہمہ جہت زندگی پر ان سب چیزوں کے اثرات مرتب ہوئے۔ خون میں رچا بسا علمی و ادبی مذاق بالآخر رنگ لایا اور شباب کی دہلیز پر قدم رکھنے کے ساتھ ہی وہ میدان ادب میں کامیابی کے جوہر دکھانے لگے'' ۳؎

۱۹۷۲ء میں بشیر احمد نحوی نے ڈگری کالج اسلام آباد میں داخلہ لیا۔ جو جنوبی کشمیر کا پہلا تعلیمی ادارہ ہے۔ یہیں پر بشیر احمد نحوی کو اپنی ادبی صلاحیتوں کو ابھارنے کا موقع ملا۔ اس حوالے سے خود ان کا ایک بیان ملاحظہ ہو:

''مجھے کالج لائف کا پہلا وقعہ یاد آرہا ہے کہ سرمائی تعطیلات شروع ہونے سے پندرہ دن پہلے ۲۹ نومبر ۱۹۷۲ء کو ایک محفل

مباحثہ کا انعقاد ہوا۔ مباحثہ کا عنوان تھا، science has done more harm to humanity than good۔

اس مباحثے کی اہم ترین خصوصیت یہ تھی کہ عنوان دس منٹ پہلے کالج کے پرنسپل جناب پیرزادہ علی محمد صاحب نے کیا، بیس پچیس مقررین نے دھواں دار تقریریں کیں، لیکن خوش نصیبی سے میری تقریر بہترین قرار دی گئی۔ شام کو ریڈیو کشمیر کے کشمیری اور اردو خبروں کے بلیٹن میں میرا ذکر کیا گیا' جس سے میری زبردست حوصلہ افزائی ہوئی، اس دن سے لیکر گریجویشن مکمل ہونے تک کالج کے تمام مباحثوں، مذاکروں اور ادبی سرگرمیوں میں میرا بڑھ چڑھ کر حصہ رہا۔'' ۴؎

بشیر احمد نحوی اس طرح نہ صرف علمی و ادبی مذاکروں اور مباحثوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے' بلکہ کالج میگزین کی ادارت بھی بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔ شوریدہ کاشمیری لکھتے ہیں:

عزیز القدر بشیر احمد نحوی سرزمین علم و ادب قصبہ بجبہاڑہ کے ایک علمی خاندان کے ابھرتے ہوئے نوجوان ہیں۔ نحوی نے گورنمنٹ ڈگری کالج اسلام آباد سے جہاں میں اردو پڑھاتا تھا' ۱۹۷۵ء میں بی۔ اے پاس کیا، طالب علمی کے زمانے میں

علمی مناظروں ، ادبی تقریبوں اور کالج میگزین کی ادارت میں
بڑی سرگرمی سے اپنے جوہر دکھائے اور اس طرح اپنے ہم
چشموں میں امتیاز حاصل کیا''۔ ۵ ؎

جان محمد آزاد لکھتے ہیں :

''ادب کا ذوق اسلام آباد کالج کے رسالے میں پروان چڑھا۔
آپ اس رسالے ''ویری ناگ'' کے ۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۵ء
تک ایڈیٹر بھی رہے''۔ ٦ ؎

کالج کے دوران ان کے بعض مضامین اس وقت کے معروف روزنامہ ''آفتاب'' میں چھپتے رہے ہیں' جن میں سے بعض مضامین کو بشیر احمد نحوی نے کتابی صورت دے کر'' محسوسات'' کے عنوان سے شائع کیا۔ بشیر احمد نحوی خود اس ضمن میں لکھتے ہیں :

''محسوسات ،، میرے بچپن کے داخلی اور خارجی تاثرات'
بکھرے ہوئے خیالات اور جذبات پر مشتمل چھوٹے بڑے
مضامین کا مجموعہ ہے ۔محسوسات میں ان مضامین کا انتخاب کیا گیا
ہے' جو روزنامہ '' آفتاب'' سرینگر کے لئے وقتاً فوقتاً لکھے گئے
تھے۔'' ۷ ؎

۱۹۷۵ء میں بشیر احمد نحوی نے بی ۔ اے کا امتحان پاس کیا اور اعلیٰ تعلیم کے لئے کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی میں داخلہ لیا،لیکن انگریزی ادبیات سے خاطر خواہ دلچسپی نہ تھی

اورانہوں نے انگریزی کے سفر کو چھوڑا اور اردو کو اپنا لیا۔شوریدہ کاشمیری لکھتے ہیں :

''کالج سے فارغ ہونے کے بعد یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی میں
داخلہ لیا' لیکن انگریزی ادبیات راس نہ آنے کے سبب اردو کی
طرف منتقل ہوئے۔'' ۸؎

بشیر احمد نحوی نے ایم۔اے اردو امتیاز کے ساتھ پاس کیا اور اس کے تین سال بعد اسلامیہ حنفیہ کالج اسلام آباد میں بحیثیت مدرس کام کرتے رہے۔ڈاکٹر بدرالدین بٹ لکھتے ہیں :

''پوسٹ گریجویشن کے بعد تین سال تک حنفیہ کالج اسلام آباد میں
اردو لیکچرر کی حیثیت سے اپنے علم وعرفان سے نوجوانانِ قوم کے
اذہان کو منور کرتے رہے'' ۹؎

حصول علم کی لذت نے بشیر احمد نحوی کو مدرسی چھوڑنے پر مجبور کیا اور انہوں نے کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ اقبالیات میں ایم۔فل میں داخلہ لیا۔ایم۔فل مکمل کرنے کے بعد ان کا تقرر دوردرشن میں ہوا۔پروفیسر شوریدہ کاشمیری لکھتے ہیں :

''بعدازاں ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے اقبال انسٹی ٹیوٹ میں
داخلہ لیا اور پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر کبیر احمد جائسی کی
نگرانی میں ایم۔فل کیا۔اسی دوران سرینگر دوردرشن میں بحیثیت
اسسٹنٹ پرڈیوسر منتخب کئے گئے'' ۱۰؎

ڈاکٹر بدرالدین بٹ کا بھی یہی خیال ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

''علم و تحقیق کے ساتھ والہانہ ذوق وشوق کے تحت نحوی صاحب نے اقبال انسٹی ٹیوٹ میں ریسرچ کے لئے داخلہ لیا اور پروفیسر پروفیسر کبیر احمد جائسی کی نگرانی میں 'اقبال اور تصوف' پر مقالہ لکھ کر ایم۔فل کی ڈگری حاصل کی، ایم۔فل کے بعد ان کا تقرر سرینگر کے دوردرشن کیندر میں بحیثیت اسسٹنٹ پرڈیوسر ہوا''

۱۱؎

بشیر احمد نحوی نے دوردرشن میں کئی سال تک کام کیا اور اپنی علمی لیاقت سے لوہا منوایا۔ اس کے باوجود علم و تحقیق کے ساتھ والہانہ ذوق وشوق اور بالخصوص اقبالیاتی ادب کے ساتھ والہانہ جذبہ عقیدت کی وجہ سے انہیں دوردرشن کی ملازمت کو خیر باد کہنا پڑا۔ دوردرشن کی ملازمت کے دوران انہوں نے شعبۂ اقبالیات سے پروفیسر آل احمد سرور مرحوم اور پروفیسر ضیاء الحسنؒ فاروقی (مرحوم) کی مشترکہ نگرانی میں 'اقبال اور تصوف، کے موضوع پر ایک بسیط مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ پروفیسر شوریدہ کاشمیری کا بیان ہے:

''ملازمت کے ساتھ ساتھ شوق تحقیق جاری رہا اور اس طرح دوردرشن سے ایک سال کی چھٹی پر جاکر یونیورسٹی میں پی۔ایچ۔ ڈی مکمل کرنے کے لئے داخلہ لیا اور یہ تگ دو جون ۱۹۸۸ء کو پوری ہوگئی، جب انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے نوازا گیا''

۱۲۔

دوسری طرف ان کی تحریک پر ریاست میں ۱۹۸۶ء میں اقبال اکیڈیمی کا قیام عمل میں لایا گیا' جس کے بانی سیکرٹری بشیر احمد نحوی ہی منتخب ہوئے۔اس کیڈیمی نے اقبالیاتی مشن پر ۹ نومبر ۱۹۸۶ء سے کام کا آغاز کیا۔اس کے تحت مختلف مقامات پر ۱۵ سے زائد ادبی تقاریب منعقد کی گئیں۔ڈاکٹر بدرالدین بٹ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''جموں وکشمیر میں ۱۹۸۶ء میں اقبال اکیڈیمی کے نام سے جو تنظیم بنی اس کے روح رواں اور جنرل سیکرٹری جناب نحوی صاحب ہی تھے ،اس ادارے کا مقصد اشاعت کتب ، سمیناروں، مباحثوں اور مجالس وغیرہ کے ذریعے تعلیمات اقبال کو ان کے صحیح تناظر میں عام کرنا تھا۔'' ۱۳۔

پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد بشیر احمد نحوی شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی میں لیکچرر منتخب ہوئے۔ڈاکٹر بدرالدین بٹ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''۱۹۸۹ء کو عام روش سے ہٹ کر نحوی صاحب نے دوردرشن کی مسحورکن (glamorous) ملازمت ترک کر کے کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی لیکچررشپ قبول کی'' ۱۴۔

خود بشیر احمد نحوی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''مجھے یاد آرہا ہے کہ ۱۰ دسمبر ۱۹۸۸ء کو کشمیر یونیورسٹی کی طرف

سے شعبہ اردو میں بحیثیت اڈہاک لیکچر رتقرری کا میرے حق میں
آڈر صادر ہوا'' ۱۵؎

اس شعبہ میں سات سال تک کام کرنے کے بعد ۱۹۹۶ء میں کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ اقبالیات میں ریڈر منتخب ہوئے اور پھر ۱۹۹۹ء میں اسی شعبہ کے ڈائریکٹر کے منصب پر فائز ہوئے۔سید مجید اندرابی اپنے مضمون 'میرا اہم سفر: تخلیقی سفر کے زیر و بم میں' میں لکھتے ہیں:

''۔۔۔بالآخر اقبال کا یہ شیدائی ترقی کی منزلوں کو طے کرتا رہا اور اپنی محنت شاقہ کی بدولت اسی ادارے کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے' بعد میں انہیں merit کی بنیاد پر open categary میں پروفیسر کے عہدہ سے سرفراز کیا گیا'' ۱۶؎

اس کے علاوہ ۲۰۱۳ء میں ڈاکٹر مجید مضمر کی وفات کے بعد جو شعبہ اردو کے صدر ہونے کے علاوہ ڈین فیکلٹی آف آرٹس کے عہدے پر فائز تھے، کی ذمہ داری سے بھی سرفراز ہوئے۔بشیر احمد نحوی ڈین کے منصب پر فائز ہونے کے علاوہ کشمیر یونیورسٹی کے south campus کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے، یہ تینوں ذمہ داریاں پروفیسر بشیر احمد نحوی احسن طریقے سے نبھاتے رہے۔

بشیر احمد نحوی نے اپنے دوران نظامت میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کا نقشہ ہی بدل دیا۔انہوں نے اس میں نئی جان ڈال دی۔انہی کی کوششوں کی بدولت یونیورسٹی کے سابقہ وائس چانسلر پروفیسر عبدالواحد قریشی نے اقبال انسٹی ٹیوٹ کے لے ایک خطیر رقم واگذار کرائی ،

جس سے شعبہ میں لائبریری، میوزیم کے علاوہ ریسرچ اسکالرز کے لئے جدید سہولیات فراہم کی گئی، جس سے تحقیقی کام میں مزید وسعت آ گئی اور نئے نئے ابعاد منقش ہو گئے۔ ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی اپنے مضمون 'کشمیر میں مطالعہ اقبالیات کا ایک جائزہ (اقبال انسٹچوٹ کے حوالے سے) میں لکھتے ہیں:

''۔۔۔محترم نحوی صاحب نے جب سے اس ادارے کی صدارت کا منصب سنبھالا ہے، تب سے اس میں ایک نئی شان وشوکت آ گئی ہے اور یک نئی حرکت وحرارت پیدا ہوگئی ہے۔اب تو اقبالیاتی فکروادب الماریوں کے خانوں سے نکل کر محفلوں مجلسوں اور مباحثوں کا موضوع بننے لگا ہے'' ۱۷؎

ڈاکٹر سید محمد فضل اللہ اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

''پروفیسر بشیر احمد نحوی وادی گلپوش، کشمیر جنت نظیر کی اس جواں سال قدوقامت رکھنے والی مجسمہ خلق کریم، دل ودماغ کو فرحت بخشنے والی شخصیت کا نام ہے جو جامعہ کشمیر میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کے ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے مشاطِ آرزو کو تروتازہ کرنے والی نہ صرف منصب اعلیٰ پر بلکہ منصبِ تقدس پر تعینات ہے۔''

۱۸؎

بشیر احمد نحوی کی علمی وادبی خدمات کو جاننے کے لئے ان کی اقبال شناسی کو جاننا ازحد

ضروری بن جاتا ہے۔ نیز یہ کہ ان کے دور نظامت میں ہوئے مختلف سیمناروں، مباحثوں کی تفصیل، ان کے زیر نگرانی ہوئے مختلف موضوعات پر تحقیقی مقالے اور ساتھ ہی ساتھ ان کی تحقیقی وتنقیدی تصنیفات وتالیفات کے علاوہ ان کے متفرق مضامین کا تذکرہ بالترتیب کرنا ضروری ہے۔

بشیر احمد نحوی بحیثیت اقبال شناس:

اردو ادب میں جس ہستی پر سب سے زیادہ تحقیقی وتنقیدی کام ہوا ہے اور ہنوز شد و مد سے جاری ہے وہ اقبال ہی ہیں۔ برصغیر ہند و پاک میں اس ہستی سے متعلق جو تحقیقی وتنقیدی مواد جمع ہے وہ شاید ہی کسی اور کے حوالے سے ملتا ہے۔علی سردار جعفری کا قول ہے کہ ایک عرصے تک ہندوستان نے علامہ کے فکر وفلسفہ کو نظر انداز کیا اور پاکستان میں اسے محدود کیا گیا۔

مگر اب تو فکر ونظر کی کشادگی اور ذہن رسا کی بالیدگی سے معاملہ بالکل برعکس ہے حریت فکر وعمل سے دونوں مما لک میں اب پوری شعوری کاوشوں سے اقبال کے متنوع فکری وعملی ابعاد پر کام شد و مد سے جاری ہے۔

علامہ اقبال کو جو مقبولیت کشمیر میں ملی اس کی بنیادی وجہ ان کا فکر وفن ہی نہیں بلکہ ان کی وراثت ہے۔اہلِ کشمیر کو اپنے اس سپوت پر ہمیشہ ناز رہا ہے۔لہذا برصغیر کے ہر حصے سے زیادہ کشمیر کے لوگوں نے انہیں گلے لگایا، اور علامہ کی کشمیر نوازگی کا پتہ ہمیں جہاں ان کی

شاعری میں ملتا ہے' وہیں ان کے خطوط سے بھی اس بابت معلوم ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنی حیات میں وہ کس نظریہ سے مسائل کشمیر پہ لب کشا تھے ان کا بھی ادراک ہمیں ملتا ہے اور غالباً اسی وجہ سے ان کی حیات میں ہی کشمیر ان کی شاعری اور فکر وعمل (اقبال شناسی) کا مرکز بنا رہا۔ کشمیر میں ان کے معاصر ادباء وشعراء ان کا رنگ وآہنگ اختیار کرتے تھے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی اپنے مضمون 'کشمیر میں مطالعہ اقبالیات کا جائزہ' میں ان کے ہمعصروں کا نام لے کر رقمطراز ہیں:

''۔۔۔منشی محمد الدین فوق' منشی سراج الدین احمد' چودھری خوشی محمد ناظر، خلیفہ عبدالحکیم، غلام احمد مہجور اور عبدالاحد آزاد جیسے ادباء وشعراء السابقون الاولون کا درجہ رکھتے ہیں۔۔۔اقبال شناسی اور اقبال فہمی کی باضابطہ تحریک برصغیر کی آزادی کے کئی سال بعد شروع ہوئی' اس سلسلے کی ابتدائی کڑی کے طور پر مشہور ماہر اقبالیات اور مقتدر ادیب وشاعر پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا نام سر فہرست ہے جن کی انتھک تحقیقی وتخلیقی کاوشوں سے نہ صرف جموں و کشمیر ہی میں' بلکہ پورے ہندوستان میں ایک طرح سے اقبالیات کا نشاۃ ثانیہ ہوا'' ۱۹؎

اقبال کی شاعری اور فکر پر ان کی حیات میں ہی لکھنے کی ابتدا ہوئی۔ جیسے جیسے ان کے افکار میں وسعت' گہرائی اور پختگی آتی گئی، اسی قدر ان پر زیادہ سے زیادہ لکھنے کی ضرورت

محسوس ہونے لگی۔اس طرح سے مطالعہ اقبال ایک مکمل شعبے کی حیثیت اختیار کرنے لگا اور اس شعبے کو بعض محققین و ناقدین نے اپنی توجہ کا مرکز بنایا اور اس طرح اپنی زندگی اسی شعبے کے مطالعات پر وقف کردی۔بشیر احمد نحوی ایسے ہی اقبال شناسوں میں سے ایک ہیں' جن کی دیدہ وری اور بصیرت افروزی،مطالعات اقبال میں تابندہ ہے۔

مطالعات اقبال سے بشیر احمد نحوی کی وابستگی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ بچپن سے ہی علامہ کے دلدادہ تھے۔وہ اس حوالے سے خود لکھتے ہیں:

''مجھے بچپن کا واقعہ یاد آرہا ہے،شاید میں چھٹی یا ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔والد صاحب بخار کی وجہ سے چند دن بستر علالت پر رہے۔ان کے ہاتھ میں تکلیف کے ایام میں صرف کلیات اقبال (فارسی) کتب خانہ نذیریہ دہلی سے شایع شدہ ایڈیشن رہتا تھا۔والد مرحوم یہ کتاب پڑھتے زار وقطار رو رہے تھے۔میں نے رونے کا سبب دریافت کیا۔اس وقت میں نے ابھی تک اقبال کا نام تک نہیں سنا تھا سوائے اسکول میں انکی لکھی ہوئی دعا''لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری'' سے میں آشنا تھا۔والد صاحب نے بتایا کہ میں یہ کلام روتے روتے اس لئے پڑھ رہا ہوں کہ اس کی تاثیر سے جسم میں درد کی شدت کم ہوجاتی ہے اور افاقہ محسوس کر رہا ہوں ۔شاید یہی وہ ایام تھے جب

میرے کانوں میں حضرت اقبال کا نام اس انداز میں پڑا اور ایسا
اثر آفرین تعارف ہوا کہ بعد میں کلام اقبال میرا اوڑھنا بچھونا بن
گیا۔'' ۲۰

اس بات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بشیر احمد نحوی کو اقبال فہمی کی طرف متوجہ کرنے والے ان کے والد ہی تھے، جن کی علمی و ادبی بصیرت سے بشیر احمد نحوی فیضیاب ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر بدرالدین بٹ لکھتے ہیں:

''جناب نحوی صاحب کا تعلق کشمیر کے ایک علمی خانوادے سے
ہے جن کی علم و ادب اور وعظ وارشاد کے سلسلے میں خدمات
ناقابل فراموش ہیں۔علم وادب سے بے حد لگاؤ اور اقبال سے
عشق ان کی گھٹی میں پڑا ہے'' ۲۱۔

اقبالیاتی ادب کے ساتھ اپنی شناسائی کے حوالے سے بشیر احمد نحوی اپنی کتاب 'اقبال عرفان کی آواز' میں لکھتے ہیں:

''اقبال کے فکر ونظر اور کلام کے ساتھ میرا تعلق بچپن سے ہی
استوار اور والد کی گہری اقبال شناسی کے سبب پائیدار رہا اور آج
بھی اقبال کا کوئی فارسی شعر جسے سمجھنے میں دقت آجاتی ہے،تو والد
صاحب کی طرف رجوع کرتا ہوں اور وہ دقت چند لمحوں کی
وضاحت میں دور ہوجاتی ہے۔اقبال کے مذہبی فکر کے جتنے ماخذ

ہیں، والد صاحب کی ان پر پوری نظر ہے۔ میرے گھر میں سعدی ، حافظ ، سنائی ، رومی ، نظامی ، عراقی ، جامی اور امیر خسرو کے افکار وخیالات کا تذکرہ ہر صبح اور شام رہتا ہے اور اقبال کے الفاظ میں 'سینہ افروخت مرا صحبت صاحب نظراں' والا معاملہ کارفرما ہے۔'' ۲۲۔

علامہ کے کلام سے ان کی محبت بڑھتی رہی، ان کی شاعری اور شخصیت سے انہیں ایک خاص لگاؤ ہے اس حوالے سے ایک شخصی انٹرویو میں بیان فرماتے ہیں :

''میرے نزدیک اقبال اردو شعراء میں سب سے زیادہ قدر آور شاعر ہیں ، جو مسلمہ طور پر ایک بڑے شاعر ہے۔ اقبال ہی اردو کے وہ واحد شاعر ہیں ، جو اپنے قاری کے وجدان کو اسی طرح متاثر کرتے ہیں جس طرح شکسپئر ، ملٹن ، دانتے ، فردوسی یا تلسی داس ۔ جہاں تک اردو شعرا کا تعلق ہے، اس ضمن میں اقبال کے سوا دوسرا نام نظر نہیں آتا۔'' ۲۳۔

بشیر احمد نحوی علامہ کی شخصیت اور کلام سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے اسی کے مطالعے کو اپنی زندگی کا شعار بنا لیا اور جو بھی موضوع چھیڑا اسے کلام اقبال سے مزین کیا اور اس میں ایسی تاثیر بخشی کہ جس کی سحر کاری میں قاری کھو جاتا ہے اور یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ عبارت یا یہ شعر اسی مناسبت اور موضوع کے لئے کہے گئے ہیں۔ ڈاکٹر ریاض توحیدی

اپنے مضمون ''پروفیسر بشیر احمد نحوی ۔۔ تیرے علم ومحبت کی نہیں ہے انتہا کوئی'' میں لکھتے ہیں:

> ''علمی وادبی حلقوں میں جہاں کہیں بھی علامہ اقبال کا ذکر ہوتا ہے تو پروفیسر موصوف (بشیر احمد نحوی) کی اقبال فہمی کا ذکر لازماً ہوتا ہے۔ کیوں نکہ پروفیسر بشیر احمد نحوی کو صرف علامہ اقبال کا تمام شعری کلام تقریباً حفظ ہے جس کی وجہ سے موصوف ''حافظ اقبال'' کے لقب سے مشہور ہیں، بلکہ اقبال کی تفہیم وتفسیر کے ضمن میں ماہرین اقبالیات نے جن لوازمات کو ضروری قرار دیا ہے اور جن علوم کی نشاندہی کی ہے ان علوم پر بھی پروفیسر صاحب کامل عبور رکھتے ہیں۔ یہ سچائی اس وقت حقیقت کے پیکر میں ڈھل جاتی ہے جب فاضل معلم کی علمی و ادبی اور درسی مجالس میں فیض اٹھانے کا موقعہ نصیب میں آتا ہے۔''۲۴؎

کلام اقبال میں ایک رجائی انداز ملتا ہے، جو مایوسیوں اور غمناکیوں پر ماتم کرنے کے بجائے قاری کے دل میں رجائیت کی شمع روشن کرتا ہے' امید دلاتا ہے اور آگے بڑھنے کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ بشیر احمد نحوی اقبال کے اسی جذبے کو لوگوں تک پہنچانے میں کوشاں ہیں جو دنیاوی دکھوں اور پریشانیوں میں روشنی کی کرن بن کر سامنے آتا ہے اور روشن مستقبل کی نشاندہی کرتا ہے۔ بشیر احمد نحوی کلام اقبال کے اسی پاکیزہ اقدار پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''۔۔۔جہاں تک اردو شعراء کا تعلق ہے تو مجھے اقبال وہ واحد شاعر نظر آتا ہے جس کی عظیم شاعری میں زندگی کی رنگینی، اخلاق کی رعنائی، فن کی گہرائی اور اقدار عالیہ کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ اقبال کی شاعری میں گل وبلبل، خال وخط، پرویز وکوہکن اور لیلیٰ ومجنون کی تلمحات اور استعارات بھی ملتے ہیں۔مگر ان تلمیحات و تشبیہات سے ہوا و ہوس کی ترجمانی کے بجائے تقدیس اظہار کا کام لیا گیا ہے۔اقبال نے عشق کا جو تصور اپنی شاعری میں پیش کیا' اس کا تعلق ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت سے ہے۔''۲۵۔

علامہ کا کلام پہلودار ہے، جو قاری کو کئی پہلوؤں سے متاثر کرتا ہے۔ان کا مطالعہ بڑا وسیع تھا۔انھوں نے اسلامی فکر کے علاوہ مغربی علوم کو بھی غور سے پڑھا تھا۔ان کا کلام قائین کو دعوت فکر دیتا ہے۔بشیر احمد نحوی اسی دعوت کو تمام عوام وخواص تک پہنچانا چاہتے ہیں تاکہ کلام اقبال کی رنگارنگیوں سے عوام وخواص نہ صرف محظوظ ہوں بلکہ احترام آدمیت کے قانون سے بھی واقف ہوں۔اس حوالے سے بشیر احمد نحوی لکھتے ہیں:

''چنانچہ اس امر کی شدت سے ضرورت محسوس ہورہی ہے کہ اقبال اور اقبالیاتی ادب کی زبان سہل، عام فہم اور روزمرہ ہو' تاکہ عام لوگ کلام اقبال کی رنگارنگیوں اور لطافتوں سے محظوظ

ہوں۔موجودہ پرآشوب عہد میں پیغامِ کی افادیت بڑھتی جارہی ہے۔احترام آدمیت کا قانون پامال ہوتا جارہا ہے اور ہر طرف افراتفری، بے اعتمادی اور بے مروتی کے نظارے دیکھنے کو مل رہے ہیں۔اقبال اس تاریکی اور تیرگی کی صورتحال میں انسان دوستی اور محبت انسانی کا فانوس روشن کرنے کی تحریک دیتا ہے۔وہ ماضی کی شاندار روایات سے استفادہ کرتے ہوئے مستقبل کو سنوارنے کی آرزو پیدا کرتا ہے۔وہ بکھرے دانوں کو ایک مالا میں پرونے اور ان کی خوشنما شیرازہ بندی کا داعی ہے''۲۶۔

علامہ اقبال کی شخصیت اور ان کی علمی بصیرت نے ہزار سال کی ملی تاریخ کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔بشیر احمد نحوی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''اس دعوے کی صداقت میں شاید اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں کہ گزشتہ ایک ہزار سال کی تاریخ میں مسلمانوں نے جس بہت بڑے دماغ کو پیدا کیا، وہ علامہ اقبال ہے۔ان کے اردو اور فارسی کلام، ان کے انگریزی خطبات، ان کے ڈاکٹریٹ کے مقالے (فلسفہ مابعد الطبیعات عجم) ان کے غیر مطبوعہ اشعار اور ان کے سینکڑوں خطوط کے بالاستیعاب مطالعہ سے اس دعوے کی

تشریح ہوتی ہے کہ ایک ہزار سال کی ملی تاریخ میں واقعتہً علامہ
اقبال جیسی ہمہ جہت اور ہمہ پہلو شخصیت ہمیں نظر نہیں آتی ہے۔''

۲۷۔

بشیر احمد نحوی ریاست میں اقبال شناسی کے ایک متحرک رکن کی حیثیت سے سرفہرست ہیں۔اس بات کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اسی شعبہ کو اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنایا اور اقبالیاتی سرمائے میں اپنی تصانیف، تالیفات، مضامین اور اس کے علاوہ سیمناروں، مباحثوں اور توسعی لیکچروں سے اضافہ کرتے رہے۔

بشیر احمد نحوی اپنی تحریروں سے یہی چاہتے ہیں، کہ اقبال کی صحیح تعلیمات کا فروغ ہو۔ وہ جانتے ہیں کہ بعض ناقدین نے یا تو محض شاعرِ اقبال کو پیش کیا ہے یا بعض نے فلسفی کے طور پر سراہا ہے اور ان پر کام بھی بہت کیا، چنانچہ اقبال کا فکر اور فن دونوں ایک ہی شے ہیں، انہیں الگ نہیں کیا جاسکتا، ان کی زندگی ایک شاعر کی زندگی تھی اور شخصیت ایک روشنی کا مینارہ۔بشیر احمد نحوی کو اس بات کا بھی احساس ہے کہ ہمارے ادب میں اقبال اپنے قدردانوں کے ہاتھوں کچھ اس غلط انداز میں پیش ہوئے کہ عامتہ الناس میں اقبال کے متعلق غلط فہمیوں کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔اس ضمن میں خود ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اقبال کے بہت سارے ناقدوں نے ذاتی اغراض کی تکمیل
کے لئے اقبال کی روح کے ساتھ زیادتی کرنے میں کوئی کمی روا
نہیں رکھی۔ان کے افکار و نظریات کو اپنے مادی افکار کی روشنی

میں پیش کرنے کی کوشش کی۔'' ۲۸؎

اقبالیات کے سلسلے میں انھوں نے اپنے مطالعے کو بڑھایا، کیونکہ اقبال ایک ایسا شاعر ہے' جس کو سمجھنے کے لئے وسعت مطالعہ کی ضرورت ہے۔ ورنہ پھر وہی غلط فہمیاں پیدا ہوسکتی ہیں جیسا کہ اکثر ناقدین اقبال میں پیدا ہوئیں۔ بشیر احمد نحوی نے عربی، فارسی اور انگریزی ادبیات کا بغور مطالعہ کیا۔ چنانچہ اقبال نے خود بھی ان زبانوں کے ادب سے استفادہ کیا ہے اور بشیر احمد نحوی نے بھی ان ماخذ کا جائزہ لیا۔ یہاں تک کہ ماہر اقبال کہلانے کے ساتھ ساتھ حافظ اقبال مشہور ہوئے۔ ایک انٹرویو میں اس بات کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''بغیر کسی تصنع کے یہ کہتا ہوں کہ میں اپنے آپ کو اس اعزاز کے مستحق نہیں سمجھتا، ماہر اقبال ہونے کے لئے اتنا علم تو شاید میرے پاس نہیں، جتنا اقبال کو سمجھنے کے لئے چاہیے۔ اقبال علم و ادب، تاریخ وفلسفہ، عمرانیات و اسلامیات کا ایک سمندر تھے اور فارسی اور انگریزی ادب پر ان کی گہری نظر تھی۔ مجھے یہ سب کہاں حاصل ہے۔ ہاں یہ بات میرے لئے مسرت کا باعث ہے کہ اقبال پر میرے چھوٹے موٹے کام لوگوں کو پسند آتے ہیں اور اہل علم قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ اقبال کے فکر وفن کو عوام وخواص تک پہنچا دوں۔'' ۲۹؎

ظاہر سی بات ہے کہ یہ ان کی انکساری ہے' ورنہ اس بات میں شبہ نہیں کہ وہ اقبالیات

میں مسلمہ مقام رکھتے ہیں اور ان کی خدمات قابل تحسین ہیں۔محمد امین بچھ صاحب اپنے ایک خط میں بشیر احمد نحوی کو خراج عقیدت یوں پیش کرتے ہیں:

''وہ خوب رو جواں عزیز القدر بشیر احمد نحوی ہیں' جس نے میرا دل موہ لیا ہے۔ وہ علم وفضل کی وادی کے ایسے جادہ پیما ہیں کہ ایک اونچے زینہ فضل پر فائز ہو رہے ہیں۔مجدد وقت علامہ اقبال کو نور بصیرت بقدر تام حاصل ہوا تھا' کیسے صرف لا الہ الا اللہ پر ایمان کامل اور عشق محمد ﷺ کا مکمل فدائی ہونے سے، ایسے مکمل عشق سے کہ وہ بڑے ایمان وایقان سے کہہ اٹھا: ؎

قوت قلب وجگر گردد نبی
ازحد محبوب تر گردد نبی

اقبال نے دعا کی:

خدایا آرزو میری یہی ہے
میرا نور بصیرت عام کردے

یہ دعا مستجاب ہوئی اور بشیر احمد نحوی جیسے جوان معرض وجود میں آئے' جن کا دل اقبال کی آہ سحر اور اس کے نورِ بصیرت سے زندہ ومنور ہے۔'' ۳۰؎

بشیر احمد نحوی نے ریاست میں اقبالیات کے لئے ایک سازگار ماحول پیدا کیا جیسا کہ

عرض کیا گیا انہیں کلام اقبال کا حافظ بھی کہا جا تا ہے۔اس ضمن میں ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی لکھتے ہیں:

''پروفیسر نحوی محتاج تعارف نہیں ہیں۔آپ صحیح معنوں میں اقبال کے مقلد ،نقیب اور عاشق ہیں۔آپ حافظ اقبال کے نام سے وادی بھر میں معروف ہیں ۔انہیں اقبال کا تقریباً تمام اردو اور فارسی کلام ازبر ہے۔'' ۳۱؎

بشیر احمد نحوی ایک سچے ،نڈر حق گو ماہر اقبال ہیں ۔ یہ خوبیاں بہت کم ادیبوں کے حصے میں آئی ہیں' جن میں اپنے محبوب شاعر کے لئے سچی تڑپ ہو، بشیر احمد نحوی ایسے ہی صاحب علم وقلم ہیں' جس نے اپنی زندگی کو اسی کام کے لئے وقف رکھا ہے۔ان کی کوششوں سے ریاست میں اقبال کی عظمت کا نشاۃ ثانیہ پیدا ہو گیا۔ وہ خود ایک جگہ لکھتے ہیں:

''خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ کشمیر میں اقبال کے ساتھ روز بہ روز دلچسپی بڑھتی جارہی ہے اور تحقیق کے عمل کے ساتھ درجنوں محققین وابستہ ہیں'' ۳۲؎

دراصل مطالعاتِ اقبال نے نحوی کا دامن موتیوں سے بھر دیا، وہ نہ صرف حافظِ اقبال ہیں بلکہ اقبالیات کے انسائیکلو پیڈیا ہیں ۔شاذ و نادر ہی ان کی زندگی کا کوئی دن ہوگا' جس میں ان کی سانسیں فکر اقبال کی آنچ میں نہ بسر ہوتی ہوں گی ۔ڈاکٹر پیر نصیر احمد لکھتے ہیں:

''پروفیسر نحوی،اقبال سے کچھ اس قدر متاثر ہیں کہ مطالعہ

اقبالیات ان کے لئے روزمرہ کی غذا بن گیا ہے'' ۳۳؎

نحوی اقبالیات کے مستقبل کے سلسلے میں بڑے پرامید ہیں اور فکرِ اقبال کی تشریح وتشہیر کو ایک مشنری جذبے کے تحت بروئے کار لانے کے آرزومند ہیں۔ چنانچہ خود اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''آیئے فکرِ اقبال کی تشریح وتشہیر کو ایک مشنری جذبے کے تحت انجام دینے کی کوشش کریں' تاکہ ہمارے معاشرے میں وہ صحت منداورصالح قدریں تقویت پاسکیں، جن سے کلام اقبال بھرا ہوا ہے۔'' ۳۴؎

الغرض بشیر احمد نحوی نے اپنی تصنیفات، تالیفات، خطابات، لیکچروں، مراسلوں سمیناروں، مباحثوں مذاکروں اور مشاعروں کے ذریعے تعلیمات اقبال کو عام کرنے کی مستحسن کوشش کی۔نحوی صاحب نے جو سمینار کرائے' ان میں نہ صرف ریاست، بلکہ بیرون ریاست سے اہل علم کو مدعو کیا اور اقبالیات کے مختلف گوشوں پر لیکچرز دلوائے۔اس حوالے سے پیر نصیر احمد لکھتے ہیں:

''۔۔۔آپ کی سربراہی میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام سیمناروں' مباحثوں' مذاکروں اور مشاعروں کا یہ سلسلہ جو دیکھنے کو ملتا ہے' واقعی اقبالیات میں ایک قابل قدر اضافہ کی دلیل پیش کرتا ہے'' ۳۵؎

آیئے اب بشیر احمد نحوی کے دورِ نظامت میں ہوئے سمیناروں کا جائزہ لیتے ہیں:

۱): وہ دانائے سبل ختم الرُسل ﷺ: یہ سمینار بشیر احمد نحوی کی صدارت میں ۱۹۹۹ء میں کشمیر یونیورسٹی میں منعقد ہوا۔ اس میں علامہ کے تصورِ عشق رسولؐ کے حوالے سے مقالہ نگاروں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

بشیر احمد نحوی نے اپنے افتتاحی خطاب میں سرت نبویؐ پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا:

''اگر آپ انسانی تاریخ کا بغور مطالعہ کریں گے تو آپ کو جو سب سے بڑی اور صاحب عظمت شخصیت جو ملے گی وہ محمدؐ کی ذاتِ اقدس ہوگی۔ آپ انسان تھے لیکن اتنے عظیم انسان کہ آج تک کسی دوسرے انسان کو اتنی بڑی عظمت نصیب نہیں ہوئی۔ دنیا کے تمام بڑے انسانوں کو ایک صف میں کھڑا کیا جائے تو آپ کا مقام سب سے اونچا اور سب سے نمایاں ہوگا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے عظمت و سربلندی آپؐ کی ذات پر ختم ہوگئی ہے اور ہر بڑا آدمی آپؐ کے مقابلے میں اپنی بڑائی سے دست بردار ہوگیا۔'' ۳۶؎

آپؐ کی شان رسالت پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر نحوی نے یوں کہا:

''آپ کا پیغام انقلابی تھا یہ ایک نئی دنیا تعمیر کرنے کی دعوت تھی۔ یہ دعوت جس وقت عرب کی سرزمین سے بلند ہوئی تو سارے ملکوں

میں ہنگامہ مچ گیا اور ہر طرف سے اس کی مخالفت ہونے لگی لیکن یہ ایک سچی دعوت تھی اور سچائی میں اتنا وزن ہوتا ہے کہ زیادہ عرصے تک اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ مخالفت کا زور ٹوٹتا چلا گیا اور ایک وقت آیا کہ اس کے ماننے والے اس کے مخالفین پر غالب آ گئے۔ یہ ایک جرات انگریز انقلاب تھا جو خدا کی زمین پر رونما ہوا لیکن جیسے جیسے وقت آگے بڑھتا گیا' اس دعوت کی گرفت اس کے ماننے والوں پر کمزور ہونے لگی اور ساتھ ہی ان کی قوت اور اجتماعیت زوال پذیر ہونی شروع ہوگئی، لیکن اس کے باوجود آج بھی بے شمار انسان اس دعوت اور رسولؐ کی محبت و عقیدت کو اپنے سینوں میں جگہ دئے ہوئے ہیں۔'' ۳۷؎

آگے پروفیسر نحوی اپنے خطاب میں اقبال کے تصورِ عشق رسولؐ کے حوالے سے یوں فرماتے ہیں:

''اقبال ایک سچے، بے لوث اور غیر متزلزل عاشق رسولؐ تھے۔ رسول اللہؐ کے ساتھ آپ کی عقیدت، محبت، وارفتگی اور وابستگی کے سینکڑوں واقعات اقبالیاتی ادب میں موجود ط ہیں۔ اقبال کے خیال میں اس جہانِ رنگ و بو کو فقط نور مصطفیؐ کی تلاش ہے اور اسی نور سے اس کی قدر و قیمت قائم ہے۔ رسول پاکؐ کے

اخلاق حسنہ کو قبول کرنے اور اپنی زندگیوں میں آپ کے احکام
کو نافذ کرنے پر زور دیتے ہوئے اقبال جگہ جگہ انداز بدل بدل
کر اپنی عقیدت مندی کا اظہار کرتے ہیں'' ۳۸۔

اس سمینار میں جن مقررین نے شرکت فرمائی' ان میں پروفیسر حامدی کاشمیری، جناب حکیم منظور، جناب پروفیسر عبداللہ شیدا، پروفیسر مرغوب بانہالی، ڈاکٹر جوہر قدوسی، ڈاکٹر تسکینہ فاضل، ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی شامل ہیں۔ان حضرات نے اس سمینار میں مختلف عنوانات سے فکر اقبال میں جذبہ عشق رسولؐ کو پیش کیا۔

سب سے پہلے پروفیسر حامدی کاشمیری نے فکر اقبال میں عشق، کے زیر عنوان اپنا مقالہ پڑھا' جس میں انہوں نے فکر اقبال میں عشق کے مفہوم کو سمجھانے کی کوشش کی ۔حامدی کاشمیری اس ضمن میں رقمطراز ہیں:

''اقبال کے خلاق ذہن نے اپنے فلسفیانہ افکار کے موثر اظہار
کے لئے جہاں بعض نئی اصطلاحیں (مثلاً خودی) وضع کیں، وہاں
انہوں نے مروجہ الفاظ کو نئے معنی پہنائے ۔لفظ ''عشق'' اس کی
مثال ہے۔عشق کو روایتی طور پر کسی چاہنے والے کی چاہت یا دو
چاہنے والوں کے باہمی جذب وکشش یا انسانی رشتوں کی شدت
کے معنوں میں برتا جاتا ہے۔تصوف میں معشوقِ حقیقی سے واصل
ہونے کے لئے حسن وعشق کی موجودگی لازمی ہے۔صوفی حسن مجاز

سے لو لگا کر اپنے جذبہ عشق کا اظہار کرتا ہے اور عشق ہی کی بدولت راہ سلوک کی منزلیں طے کر کے فنا فی الذات ہوتا ہے۔ گویا عشق مادی حسن سے آغاز سفر کر کے حسن ازل کو منزل مقصود بناتا ہے۔ اقبال نے اس لفظ کو نئی معنوی وسعت سے آشنا کیا اور اپنی فکر کو اس میں سمویا۔ اقبال انسانی جذبوں، جبلتوں اور رشتوں کا گہرا احساس تو کرتے ہیں لیکن وہ سطح پسندی کے بجائے دلِ وجود کی گہرائیوں میں اترتے ہیں اور نادید حقائق کا انکشاف کرتے ہیں جہاں تک عشق کا تعلق ہے وہ اس کی جبلی اور نفسیاتی اصل کو نظر انداز کرتے ہوئے بھی اس کی ارتقاعی تقلیب کرتے ہیں۔ اس لئے وہ انسان کو محض گوشت پوست کا لوتھڑا نہیں سمجھتے بلکہ وہ اس کی باطنی قوت کا ادراک رکھتے ہیں، جو اسے فکری اور روحانی رفعتوں پر فائز کرسکتی ہے۔'' ۳۹۔

جناب حکیم منظور نے اپنا مقالہ ''اقبال کی شاعری میں ذکر رسولِ مقبولؐ'' کے عنوان سے پڑھا۔ اس میں حکیم منظور نے اقبال کی شاعری میں رسولؐ کے ذکر کو مدلل حوالوں سے پیش کیا ہے۔ اپنے مقالے میں حکیم منظور لکھتے ہیں:

''اقبال کے کلام میں ذکر رسولؐ کی تلاش سمندر میں پانی کی تلاش کرنے کے مترادف ہے چونکہ علامہ کی شعری اور نثری کاوشوں

کی لہر زیریں رسول اللہؐ کے ذکر جمیل اور فکر بلند ہی سے عبارت ہے، اس لئے بداہتہً در پردہ بالواسطہ اقبال کی ان کاوشوں میں حضورؐ کا ذکر درآتا ہے اور صاحب نظر لوگوں کو نئے رنگوں اور ان کے ذہنوں کو نئی روشنی سے شاداب وسیراب کرتا ہے۔ میری ذاتی رائے یہاں تک ہے کہ ذکر جمیل رسولؐ کے افکار اور اسوۂ حسنہ نے ہی اقبال کے قلمی رویوں کو استوار کیا اور اس کے اسلوب کو ترتیب دیا ہے۔ وہ راست انداز میں اخلاق واقدار اور شیرین گفتاری کے اسی سرچشمہ اول وآخر یعنی محمدؐ سے وابستگی کی دین ہے۔ اقبال کی تمام تر قلمی کاوشیں اس خیال کی تصدیق کرتی نظر آتی ہیں۔'' ۴۰؎

حکیم منظور نے اپنے مقالے کے آخر میں کہا:

''وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے غبار راہ کو بخشا فروغ وادیٔ سینا اس پر کل بنی نوع انسان کی شکرگزاری اور محبتیں نثار کرنا بنی نوع انسان پر قرض ہے۔'' ۴۱؎

اقبال اور جامی کے زیر عنواں پروفیسر محمد عبداللہ شیدا نے اپنا مقالہ پیش کیا، جس میں انہوں نے اقبال اور جامی کو ملت اسلامیہ کے دو عظیم فرزند اور عظیم شاعر قرار دیا۔ جامی اور اقبال بلند مرتبہ عاشق رسولؐ تھے۔ دونوں کا اظہار عشق جداگانہ ہے۔ علامہ اقبال سیرت

پاک کے مختلف واقعات سے ایک تحریک پیدا کر کے نعت رسول کا کوئی پہلو اس انداز سے اجاگر کرتے ہیں' جس سے آپ کا اسوۂ حسنہ مصور ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ اپنے مقالے میں پروفیسر شیدا نے کہا:

''ہماری ملی تاریخ نے اپنی روحانی، جذباتی اور فکری نشو نماء اور اس کے وجود و بقا کے لئے جو بلند مرتبہ مفکر' شاعر اور نابغہ روزگار شخصیتیں پیدا کیں' ان میں جامی اور اقبال دونوں کا مقام بہت بلند ہے۔ دونوں نے اپنے اپنے دور میں اسلام کی فکر اور ثقافتی روایات کے وارث اور مستقبل پر حیات پرور اور بصیرت افروز اثرات مرتب کرتے ہوئے ایسا کلام اپنے پیچھے چھوڑا جو نہ صرف مسلمانوں کے لئے بلکہ ساری نوع انسانی کے لئے بصیرت افروز اور روح پرور ہے۔ دونوں کے درمیاں پونے پانچ سو سال کا بعد مکانی ہے' پھر بھی دونوں کے درمیان کئی قدریں مشترک ہیں۔''۴۲۔

پروفیسر مرغوب بانہالی نے ''فارسی نعتیہ ادب۔۔اقبال کی حجازی لے سے نوازنے والا سوز و ساز کا ممتاز سرچشمہ'' کے زیر عنوان اپنا مقالہ پڑھا۔ پروفیسر موصوف کا کہنا ہے کہ زندگی اور اس کے مسائل کے متعلق جو گانٹھیں اقبال کے سامنے فلسفہ نہ کھول سکا، وہ کام فارسی ادب نے احسن طریقے سے انجام دیا۔ اپنے مقالے میں پروفیسر موصوف کہتے ہیں:

''اقبال کو اعتراف ہے کہ زندگی کے مختلف مسائل سے متعلق جو گانٹھیں فلسفے کے ناخنِ تدبیر سے کھلنے کا نام نہ لیتی تھیں اور حقیقت شناسی کے جو دروازے فلسفہ و منطق کے سامنے بند پڑے تھے انہیں اقبال کے سامنے ایک ایک کر کے کھولنے کی کرامت مولانا رومیؒ اور مولانا جامیؒ کے اشعار ہو سکتے تھے' جن میں عشق رسولؐ اور شرعِ رسولؐ کی روشنی بشان الہام سانے آ گئی ہے۔ اقبال جیسے شعراء کو عشق رسولؐ کے آداب سکھانے والے اولین درجہ کے نعت گو فارسی شاعروں میں مولانا رومیؒ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ رومی عشق رسولؐ کے سوز میں مضمر قوت اور دیگر حیات بخش امکانات کو نشاندہی میں لاتے ہیں۔ لافانی سرور حاصل کرنے کے اسرار بھی یہ سمجھا کر فاش کرتے ہیں کہ ہمیں اللہ سے درد و سوز کی دولت سرمدی مانگتے رہنا چاہئے۔'' ۴۳ ؎

ڈاکٹر جوہر قدوسیؔ نے ''علامہ اقبال کا نعتیہ کلام'' کے زیر عنوان اپنا مقالہ پیش کیا' جس میں انہوں نے کہا کہ اقبال اگر چہ رسمی معنوں میں ایک نعت گو شاعر نہ تھے مگر ان کی شاعری میں اس قدر نعتیہ عناصر موجود ہیں کہ ان کا ذکر اردو نعت کی تاریخ میں جلی حروف میں کیا جا سکتا ہے۔ دراصل اقبال ایسے محرم راز درون میخانہ کی پوری شاعری ہی چیزے دگر ہے۔ اس وارفتہ عشق رسولؐ کی ادا ہی نرالی ہے' رنگ ہی جدا ہے' انداز ہی الگ ہے کلام کا

مطالعہ کیجئے تو بیشتر حصہ عشق رسولؐ کی تجلیوں کا مظہر نظر آئے گا۔

ڈاکٹر جوہر قدوسیؔ نے مختلف بیانوں سے یہ بات سامنے لائی کہ رحمتہ للعالمینؐ کی شخصیت جن فیوض و برکات و احسانات سے متصف ہے۔ ان کا عکس کلام اقبال میں جا بجا ملتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''علامہ کی اردو شاعری میں ایسے بے شمار مقامات نظر آتے ہیں جہاں ان کا کلام بظاہر نعتیہ نہ ہوتے ہوئے بھی نعتیہ شاعری کی متذکرہ بالا تعریف کی حدود میں آجاتا ہے اور یوں رسمی معنوں میں ایک نعت گو شاعر نہ ہوتے ہوئے بھی علامہ اردو کی نعتیہ شاعری میں اپنے معنوی نعتیہ کلام سے ایک الگ اور منفرد اسلوب کے ساتھ خوشگوار اضافہ کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔''

۴۴؎

ڈاکٹر تسکینہ فاضل نے ''حضورؐ کا نظریہ شعر اور اقبال اسرار خودی کی روشنی میں'' سید محمد مجید اندرابی نے ''سرور دو عالمؐ کی سیرت و اخلاق اقبال اور مغربی مفکرین کی نظر میں'' عبدالرحمان مخلص نے ''اقبال کا تصورِ عشق میری نظر میں'' مشتاق احمد گنائی نے ''اقبال کا تصور رسالت'' اور شاہ محمد اعجاز اشرف نے ''اقبال اور محبت رسولؐ'' زیر عنوان مقالے بالترتیب پیش کئے۔

۲): اقبال اور معاصر نظام تعلیم:

یہ سمینار ڈاکٹر بشیر احمد نحوی ڈائریکٹر اقبال انسٹی ٹیوٹ کی سربراہی میں اکتوبر ۲۰۰۰ء میں منعقد ہوا۔ اس سمینار میں ریاست اور بیروں ریاست کے ماہرین تعلیم اور اقبالیات سے شغف رکھنے والے اہل حضرات نے شرکت فرمائی۔

اس موضوع پر جن دانشوروں نے اپنے اپنے مقالات پیش کئے' ان میں پروفیسر محمد عبداللہ شیدآ' جناب غلام محمد خان' پروفیسر عبدالغنی مدہوش' پروفیسر سید حبیب، پروفیسر عبدالحق، جناب طارق مسعودی وغیرہ شامل ہیں۔ اس سمینا میں سب سے داد طلب اور طویل مقالہ پروفیسر محمد عبداللہ شیدآ کا ''اقبال اور معاصر نظام تعلیم'' کے زیر عنوان تھا۔ پروفیسر موصوف نے اپنے مقالے میں کہا:

> ''فکر اقبال میں افراد کی تربیت ہر شے پر مقدم ہے۔ وہ فرد کی تربیت اس انداز سے کرنا چاہتے ہیں جو اسے سخت کوشی، جاں گدازی اور خارا نگاری کے لئے تیار کرے۔ ہر فرد کی یہ ہمہ جہت تربیت اقبال کے تصورِ خودی میں مرکوز ہے۔''
>
> مزید کہتے ہیں: ''اپنی خدا داد بصیرت اور مومنانہ فراست سے گہرا جائزہ لے کر اقبال عصری نظام تعلیم کی خامیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے اسے نئی نسل کے حق میں ایک مجرمانہ سازش قرار دیتے ہیں'' ۴۵ ؎

۳): اقبال اور تعمیر آدمیت:

یہ دو روزہ سمینار کشمیر یونیورسٹی میں ۲۱۔۲۲ اپریل ۲۰۰۱ء میں بشیر احمد نحوی کی سربراہی میں منعقد ہوا۔اس سمینار میں ریاست اور بیرون ریاست کے سرکردہ ماہرین اور دانشور مدعو تھے۔اس تقریب کے مہمان خصوصی ریاستی ہائی کوٹ کے جسٹس علی محمد میر تھے ،اس کے علاوہ کشمیر یونیورسٹی کے طلباء وطالبات اور عاشقانِ اقبال کی ایک کثیر تعداد بھی موجود تھی۔

پروفیسر بشیر احمد نحوی نے اپنے افتتاحی خطاب میں کہا:

''اقبال کی شاعری پر عمومی نظر ڈالتے ہوئے اس بات کا احساس ہوتا ہے' کہ محبت، مروت ،امنِ عالم، انسان دوستی آدم شناسی، مقام آدمیت، ہمدردی دلنوازی اور آحترام آدمی کے تصورات اپنی تمام تر وسعتوں کے ساتھ کارفرما ہیں۔اقبال ان اقداروں کے نہ صرف مداح بلکہ ان کے داعی ونقیب بھی ہے۔ وہ مصاف زندگی میں سیرت فولاد کی صفت ،شبستان محبت میں حریر و پرنیاں کی خصوصیت کا متمنی ہے۔موجودہ زمانے میں جب کہ دنیا بے شمار قسم کے تہذیبی ،لسانی اور سیاسی مسائل اور فتنوں کا شکار ہو چکی ہے اور نسلی برتری نے کئی برادریوں کو پریشانیوں میں مبتلا کر کے رکھ دیا ہے' اقبال کا نظریہ تعمیر آدمیت ،ان پریشانیوں کو کم کرنے اور ایک بہترین انسانی معاشرے کے قیام میں مددگار ثابت

ہوسکتا ہے۔ ؎

مصاف زندگی میں سیرت فولاد پیدا کر

شبستان محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

گزر جابن کے سیل تند خوکوہ و بیابان سے

گلستان راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

۴۶؎

اس موقعے پر جن حضرات نے اپنے اپنے مقالات پیش کئے‘ ان میں پروفیسر حامدی کاشمیری، پروفیسر قاضی عبیدالرحمان ہاشمی، جناب جسٹس علی محمد میر، جناب حکیم منظور، پروفیسر قدوس جاوید، پروفیسر سید مجید اندرابی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

پروفیسر حامدی نے اپنا مقالہ بہ عنوان اقبال اور مقام آدمیت‘‘ پیش کیا ،جس میں پروفیسر موصوف کا کہنا ہے کہ ایک بڑے مفکر کی طرح اقبال نے کائنات میں آدمیت کی اصل کی دریافت اور اس کے عمل کی تعین کو بنیادی اہمیت دی ہے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ ان کے یہاں یہ تلاش ،تلاش حق بن جاتی ہے اور سوز دل سے شعر میں منتقل ہوجاتی ہے۔

پروفیسر حامدی نے مزید کہا:

’’اقبال کے یہاں آدمیت کا تصور محض خیالی، رومانی یا نظری نہیں ہے جیسا کہ بعض سمجھتے ہیں۔ اقبال ایک حقیقت شناس مفکر ہیں انہوں نے آدمیت کا تصور انفرادی سطح پر اپنے آدم زاد ہونے

سے اخذ کیا ہے جیسا کہ ان کے نظریہ خودی جسے وہ تعین ذات قرار دیتے ہیں، پر زور دینے سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ آدمی کے لئے سراغ زندگی کو پانے کے لئے اپنے من میں ڈوب جانے کو لازمی قرار دیتے ہیں ۔ایسا کرنے سے اس کی بحیثیت سچائی authenticity قائم ہو جاتی ہے۔ یہ خود آگہی انسان کو مرد مومن کے رتبے پر فائز کرتی ہے۔''۴۷؎

پروفیسر قاضی عبید الرحمان ہاشمی نے''تعمیر آدمیت کا مطالعہ :شعر اقبال کی اقداری جہات'' کے زیر عنوان اپنا مقالہ پیش کیا۔اس میں پروفیسر موصوف نے کہا تعمیر آدمیت فکر اقبال کی نسبت سے ایک ایسی مہتم بالشان تخلیقی سرگرمی ہے جس کا فی الواقع کوئی تصور اقدار کے حوالے سے تقریباً ناممکن ہے اقبال ہمارے ان دانشوروں میں ہیں جن کی سیاسی بصیرت سے پوری طرح اتفاق کئے بغیر بھی اتنی بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ وہ زندگی کے مجموعی نقشے اور خاکے میں الوہی و روحانی اقدار کا رنگ بھرا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔اس امتیاز کے بغیر ان کے نزدیک کسی بھی معاشرتی اور تمدنی فلسفے، نظام زندگی اور سیاسی و سماجی نظریے کو سند قبولیت حاصل نہ تھی۔ وہ کہتے ہیں:

''شعر اقبال کی اقداری جہات کے مطالعے میں مذہبی اور روحانی اقدار کی مرکزیت سے انکار ناممکن ہے۔خصوصاً اس لئے بھی اقبال کے مذہبی معتقدات محض ذاتی اور شخصی نوعیت کے نہ

تھے۔ان کے نزدیک مذہبی وظائف مجموعی زندگی اوراس کی تمام سرگرمیوں پر محیط ہیں۔شعر اقبال کی اقداری جہت کے کم از کم تین رخ یعنی جمالیاتی اقدار، سیاسی وسماجی اقدار، مذہبی اور روحانی اقدار ہمارے سامنے آجاتے ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ کس طرح یہ جملہ اقدارشاعری کی تخلیقی بصیرت کا لازمی جزو بن کر بتدریج منصۂ شہود پر آتی ہیں اور ایک کلیت میں ڈھل جاتی ہیں۔''۴۸۔

اس کے علاوہ ''اقبال اورتعمیر انسانیت'' کےعنوان سے پروفیسر ظہور الدین نے، اقبال اورمروت از جسٹس علی محمد میر، ''عالمگیر انسانی قدروں کا امین'' ازحکیم منظور، پروفیسر قدوس جاوید نے اقبال اور انسان کے امکانات کی بلندی اور سید مجید اندرابی نے اقبال داعی امن عالم کے' زیرعنوان اپنے اپنے مقالے پیش کئے۔

۴): اقبالیات کے گزشتہ دس سال ایک تحقیقی وتنقیدی جائزہ:

یہ دوروزہ قومی سمینار ڈائریکٹر اقبال انسٹی ٹیوٹ بشیر احمد نحوی کی سربراہی میں ستمبر ۲۰۰۳ء میں منعقد ہوا۔اس میں ۱۹۹۳ء سے ۲۰۰۲ء تک اقبال پر ہوئے کام کا جائزہ لیا گیا۔اپنے افتتاحی خطاب میں پروفیسر بشیر احمد نحوی نے کہا:

''ہم نے کئی ریاستوں کے نامور ماہرین اقبال سے سمینار میں شمولیت کی استدعا کی تھی۔لیکن مصروفیات، کشمیر کے حالات اور

نجی مجبوریوں کے سبب تمام مدعو اسکالر سمینار میں شرکت نہ کر سکے۔تاہم دہلی ، الہٰ آباد، بھوپال اور جموں سے چند اساتذہ ادب اس سمینار میں شریک ہوئے۔''۴۹۔

اقبالیاتی ادب سے وابستہ ادیبوں اور انجمنوں کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر نحوی نے کہا:

''اقبالیاتی ادب سے وابستہ تمام ادارے مالی دشواریوں کے باوجود تحقیقی امور اور دیگر سرگرمیوں کو گرمجوشی کے ساتھ جاری رکھے ہوئے ہیں۔''۵۰۔

اس سمینار میں جو مقالے پڑھے گئے' ان میں پروفیسر عبدالحق نے بہ عنوانِ دربادہ امروزم کیفیتِ فردابین'' پروفیسر آفاق احمد کا ''بھوپال میں اقبالیات'' پروفیسر ظہورالدین نے عثمانیہ یونیورسٹی کے سابق پروفیسر (انگریزی) جناب سراج الدین کی کتاب 'مطالعہ اقبال' کا جائزہ پیش کیا' پروفیسر علی احمد فاطمی نے آل احمد سرور کی اقبال شناسی کا تفصیلی جائزہ پیش کیا' کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے پروفیسر قدوس جاوید نے مسائل تصوف اور اقبال کے حوالے سے پروفیسر بشیر احمد نحوی کی اقبال شناسی (جس میں انہوں نے اس کتاب کو سراہا اور اسے وقت کی ضرورت قرار دیا) کے حوالے سے اپنا مقالہ پڑھا۔ پروفیسر قدوس جاوید نے اپنے مقالے میں کہا:

''آج کے عصری عالمی حالات خصوصاً فلسطین، چیچنیا، عراق، گجرات اور کشمیر کے آتشیں واقعات کو ذہن میں رکھ کر ملت

اسلامیہ کی حالت پر غور کریں‘ تو معلوم ہوگا کہ ہر طرح کی
اذیتوں کا سامنا کر لینے اور مستقل کرتے رہنے کے باوجود ملت
اسلامیہ، رہبانیت، بے عملی سکر اور بے نیازی میں مبتلا ہے۔ ایسے
میں بشیر احمد نحوی نے مسائل تصوف اور اقبال لکھ کر شعوری یا
لاشعوری طور پر اقبال کی وحدت الشہودی فکر، کے حوالے سے
اقبال کے جہد وعمل کے نظریہ کو زندہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور
یہی وقت کی ضرورت ہے۔‘‘ ۵۱؎

علاوہ ازیں اس سمینار میں پروفیسر بشیر احمد نحوی نے اپنا مقالہ بہ عنوان پیر مغرب شاعر المانوی‘ ڈاکٹر تسکینہ فاضل نے اقبال انسٹی ٹیوٹ کی چند مطبوعات کا جائزہ پیش کیا‘ پروفیسر شہاب عنایت ملک نے ’’پروفیسر محمد اندرابی کی مرتب کردہ کتاب ’اقبالیات کا تنقیدی جائزہ‘‘ کے زیر عنوان اپنا مقالہ پیش کیا‘ ساتھ ہی ساتھ ڈاکٹر توقیر احمد (دہلی یونیورسٹی) نے اپنے شعبہ کی اقبالیاتی سرگرمیوں پر مقالہ پڑھا‘ اسداللہ وانی نے جموں وکشمیر کلچر اکیڈیمی کی اقبالیاتی سرگرمیوں کا جائزہ پیش کیا۔

۵): پروفیسر جگن ناتھ آزاد سمینار:

یہ سمینار ۶ اور ۷ اکتوبر ۲۰۰۴ء کو اقبال انسٹی ٹیوٹ میں منعقد ہوا۔ اس میں بین الاقوامی شہرت یافتہ ماہر اقبال، ’’پروفیسر جگن ناتھ آزاد‘‘ کی خدمات عالیہ پر مختلف علماء نے ان کی شخصیت کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی۔ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر جناب پروفیسر بشیر

احمد نحوی نے اپنے خطاب میں کہا:

''آزاد کی وفات اردو شعر وادب کے لئے ایک بڑا سانحہ تھا۔ آزاد ایک سخنور، سخن سنج، بے بدل ادیب تھا۔ معلومات کا ایک خزانہ ان کے ذہن میں ظ تھا۔ اس صدی کے تقریباً تمام شعراء کے کلام کے محاسن ومعائب سے وہ بخوبی واقف تھا۔ شاعر مشرق کے اردو اور فارسی کلام پر گہری دسترس حاصل تھی اور بلا مبالغہ آزاد اقبالیات کی چلتی پھرتی ڈکشنری کی حیثیت رکھتے تھے۔''

۵۲۔

کشمیر یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر اور معروف ناقد پروفیسر حامدی کاشمیری نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا:

''آنجہانی آزاد علامہ اقبال کے سچے عاشق تھے۔ وہ علامہ کے مختلف ذہنی وفکری اور علمی ابعاد کو توصیفی اور تکریمی انداز سے منکشف کرتے رہے، یہ کام انہوں نے اس زمانے میں شروع کیا جب برصغیر میں ابھی انتہا پسندی، تعصب اور منافرت کے سائے تحلیل نہیں ہوئے تھے، یہ کام ذہن وفکر کے آزادانہ، عالمانہ اور قدرشناسانہ رویے کا متقاضی تھا جگن ناتھ آزاد کی اقبال شناسی اسی رویے کی مرہون تھی اور وہ عمر کے آخری لمحے تک اسی پر قائم

رہے'' ۵۳؎

اس سمینار میں جو مقالے پڑھے گئے' ان میں پاکستان کے معروف ماہر اقبالیات پروفیسر رفیع الدین ہاشمی نے 'پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا اصل کارنامہ' دہلی یونیورسٹی کے سابق پروفیسر عبدالحق نے 'کرتا ہے تراجوش جنوں تیری قبا چاک' ڈاکٹر عتیق اللہ نے 'جگن ناتھ آزاد شخص اور شاعر' پروفیسر مرغوب بانہالی نے ہندستان میں اقبالیات آزادی کے بعد'' ڈاکٹر فیروز احمد نے'' مشترکہ تہذیب اور جگن ناتھ آزاد' ڈاکٹر محمد شاہد حسین نے'' آزاد کی شاعری'' پروفیسر علی احمد فاطمی نے'' قندیل محبت کی ضیا چھوڑ گئے ہم'' پروفیسر قدوس جاوید نے'' جگن ناتھ آزاد چند تاثرات'' پروفیسر بشیر احمد نحوی نے'' جگن ناتھ آزاد: انسانی اقدار کا شاعر'' کے زیر عنوان اپنا مقالہ پڑھا۔اس مقالے میں پروفیسر نحوی نے آزاد کی شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے کہا:

'' آزاد کا فنی وجدان آدمی کو متاثر کرتا ہے جہاں انتقال خیالات میں کوئی شے مانع نہیں ہوتی ہے' وہ متانت، صلابت، پختگی، شعور اور مروت وانسانیت کی جملہ قدروں کو لے کر آگے بڑھتا ہے۔ جذبات کا خلوص' انداز بیاں کی سحر کاری گویا ایک ٹھہرا ہوا سمندر ہے۔ ان کی شاعری محض ماتم ملک اور ماتم انسانیت نہیں، بلکہ ایک مکمل داستان ہے۔ ان کے پر خلوص احساسات کی جس کی عظمت سے انکار ممکن نہیں۔'' ۵۴؎

اس کے علاوہ اس سمینار میں ڈاکٹر تسکینہ فاضل نے ''جگن ناتھ آزاد کی کتاب''اقبال اور اسکا عہد'' کا جائزہ پیش کیا۔ ڈاکٹر ضیا الدین نے پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے تین سفر ناموں کا جائزہ پیش کیا' ڈاکٹر طارق احمد مسعودی نے جگن ناتھ آزاد کی نعت گوئی کو موضوع بنایا' اقبال انسٹی ٹیوٹ کے سابق لائبریرین جناب عبداللہ خاور نے تاثراتی مقالہ پیش کیا۔ علاوہ ازین ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی' سید محمد فضل اللہ' ڈاکٹر سید مجید اندرابی' ڈاکٹر ایم۔ اعجاز اشرف' سید اقبال قریشی نے جگن ناتھ آزاد کی شخصیت' شاعری' ان کے تبحر علمی اور وسیع المرتبی پر مقالات پیش کئے۔

اس کے علاوہ پروفیسر نحوی کی زیر سرپرستی میں جو سمینار منعقد ہوئے ہیں' ان میں کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ ریاضی کے سابق سربراہ اور معروف شاعر، نقاد اور دانشور پروفیسر قاضی غلام محمد مرحوم کی شخصیت اور شعری وتنقیدی خدمات پر سمینار' اسی طرح جولائی ۲۰۰۷ء میں ریاست کے سرکردہ اردو اور کشمیری زبان کے شاعر جناب حکیم منظور مرحوم کی کثیر الجہت شخصیت پر وادی کے سرکردہ ادباء و محققین اور دانشور حضرات کے علاوہ بیرون ریاست کے اصحاب علم و فضل نے مقالات پڑھے۔

پروفیسر بشیر احمد نحوی بحیثیت نگراں:

بشیر احمد نحوی ایک مقبول استاد اور نگراں کی حیثیت سے اپنا ثانی نہیں رکھتے ہیں۔ وہ اخلاص، محبت، شفقت اور جذبہ شوق کے تحت مدرسی کا پیشہ اختیار کر چکے ہیں اور ان کا پڑھایا ہوا سبق نقش برسنگ ہو کے رہ جاتا ہے۔ ؎

درس ادیب اگر بود زمزمہ محبتے
جمعہ بہ مکتب آورد طفلِ گریز پاے را
نظیری

ترجمہ: استاد کا سبق اگر محبت کا سرچشمہ ہو، تو بھگوڑا لڑکا جمعہ (چھٹی کا دن) کو بھی اسکول آئے گا۔یعنی مشفق استاد کی کشش اسے چھٹی کے روز بھی گھر پر بیٹھنے نہیں دے گی۔

بشیر احمد نحوی اس کی جیتی جاگتی مثال ہیں۔ ان کے زیر نگرانی مختلف موضوعات پر کئی اسکالروں نے کام کیا ہے، جس سے ان کی باریک بینی، ضرورت وقت کے ساتھ ساتھ ان کی علمی وادبی خدمات کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی نگرانی میں تقریباً دو درجن سے زائد اسکالروں نے اپنے اپنے مقالات تیار کر کے سندیں حاصل کی ہیں۔ ڈاکٹر ریاض توحیدی اپنے مضمون میں اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ’’کہا جاتا ہے کہ کامیاب استاد وہی استاد کہلانے کا مستحق ہے جس کے شاگرد بھی کامیابی کے ساتھ آگے بڑھ سکیں۔ اس میں استاد کی رہنمائی کا بھی حصہ ہوتا ہے اور خلوص بھی شامل رہتا ہے۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی سے فارغ شدہ ایم۔فل، اور پی۔ایچ۔ڈی اسکالرس جو پروفیسر بشیر احمد نحوی کی نظامت کے دوران فارغ التحصیل ہوئے، ان میں اکثر اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز ہیں۔ اس کی ایک بہت بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ جو سکالر اس

انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لیتا ہے تو اسے ریسرچ کے دوران ذہنی نشو ونما کو فروغ دینے کا مکمل علمی وادبی ماحول ملتا ہے۔اور پروفیسر موصوف درس وتدریس کے ساتھ ان کے حوصلوں کو بھی نکھارنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں اور ہمیشہ اس بات کے فکرمند ہوتے ہیں کہ ؎

ہواؤں میں اڑیں، پیڑوں پہ چہکیں
پرندوں کو سدا آزاد رکھنا

۵۵؎

آیئے اب ان مقالوں کا تذکرہ کرتے ہیں جو پروفیسر بشیر احمد نحوی کے زیر نگرانی پایۂ تکمیل کو پہنچ چکے ہیں۔

ا)فلسفہ اقبال میں اجتہاد کی اہمیت: یہ مقالہ مشتاق احمد گنائی نے پی۔ایچ۔ڈی کے لئے پروفیسر بشیر احمد نحوی کی نگرانی میں تحریر کیا۔ یہ مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے مشتاق احمد گنائی کے اس مقالے کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ یہ سب سے پہلا پی۔ایچ۔ڈی مقالہ ہے جو پروفیسر نحوی کی نگرانی میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ یہ مقالہ ۲۰۰۳ء میں کتابی شکل میں پروفیسر بشیر احمد نحوی کے پیش لفظ اور پروفیسر قمر رئیس کی تقریظ کے ساتھ شائع ہوا۔

۲) اقبال اور آزاد کا تصور آزادی: یہ مقالہ محمد شفیع کھانڈے نے اپنے ایم۔فل پروگرام میں پروفیسر نحوی کی نگرانی میں تحریر کیا ہے۔ یہ مقالہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں تصور آزادی کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ دوسرے باب میں اقبال کے تصور آدم، تصور حیات اور سماجی تصور آزدی کے ساتھ ساتھ مذہبی اور اخلاقی آزادی کے بارے میں اقبال کے تصورات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ تیسرے باب کو مولانا ابوالکلام آزاد کے تصور آزادی، ان کی نفسیاتی، سماجی تصورات کے لئے وقف کیا گیا ہے۔ چوتھے باب میں مولانا آزاد اور اقبال کے تصورات کا تقابل کیا گیا ہے۔

۳) اقبال کی شاعری کا اصلاحی پہلو: اعجاز اشرف شاہ نے ایم۔فل کا مقالہ پروفیسر نحوی کے زیر نگرانی تحریر کیا۔ اس میں پانچ ابواب ہیں۔ پہلے باب میں شاعری کے سماجی پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرے باب میں اقبال کی معاصر اصلاحی تحریکوں کا بیان ملتا ہے۔ تیسرا باب اقبال کے تصور شعر پر مبنی ہے۔ چوتھا باب اقبال کے فکری نظام کے مطالعہ پر مشتمل ہے۔ پانچویں باب میں کلام اقبال کا اصلاحی پہلو بیان کیا گیا ہے۔

۴) معاصر اصلاحی تحریکیں اور اقبال: یہ مقالہ محمد اعجاز اشرف شاہ نے پی۔ایچ۔ڈی کے لئے پروفیسر بشیر احمد نحوی کی زیر نگرانی میں پایہ تکمیل کو پہنچایا۔ مقالہ تین ابواب پر مشتمل ہے۔ اس مقالے کے بنیادی باب یعنی تیسرے باب میں اقبال کی معاصر تحریکوں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

۵)اقبال کی اردو شاعری کے اماکن (ایک مطالعہ): یہ ایم۔فل کا مقالہ ظفر اقبال نے پروفیسر بشیر احمد نحوی کی زیر نگرانی تیار کیا۔اس مقالے کے دو باب ہیں۔ پہلے باب میں اقبال کی اردو شاعری کے اماکن کا جائزہ پیش کیا گیا ہے اور دوسرے باب میں اقبال کی شاعری میں موجودہ اماکن کی اہمیت اور افادیت و معنویت پر بحث کی گئی ہے۔

۶)اقبال کی اردو شاعری میں تصور اخلاق (ایک مطالعہ): پروفیسر بشیر احمد نحوی کی زیر نگرانی تحریر کیا گیا یہ ایم۔فل کا مقالہ رخسانہ حسن کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ یہ مقالہ تین ابواب پر مشتمل ہیں۔

۷) Iqbal,s message to youth پروفیسر نحوی اور ڈاکٹر نسیم حمید رفیع آبادی کی مشترکہ نگرانی میں یہ تیار کردہ مقالہ شہناز اقبال قریشی نے ایم۔فل کے پروگرام میں مکمل کیا۔ یہ مقالہ چار ابواب پر مشتمل ہیں چوتھا باب مقالے کا بنیادی باب ہے۔ اس میں اقبال کی شاعری کو زیر بحث لایا گیا ہے اور اس میں جو پیغام جوانانِ ملت کے لئے ہے، اسے پیش کیا گیا ہے۔

۸)اقبال کی فطرت شناسی ،بانگ درا' کے حوالے سے: تین ابواب پر مشتمل یہ مقالہ محمد شمیم نے پروفیسر نحوی کی نگرانی میں ایم۔فل کے دوران تیار کیا۔

۹)اقبال کا تصور ولایت: پروفیسر نحوی کی نگرانی میں ایم۔فل کے اس مقالے کو سید محمد فضل اللہ نے ضبط تحریر میں لایا۔ مقالے کے پہلے باب میں اقبال کے تصور ولایت کو

موضوع بنایا گیا ہے۔ دوسرا باب اقبال کی شاعری میں مقام کے حوالے سے ہے۔ تیسرے باب میں تصور ولایت کا جائزہ پیش کیا گیا ہے اور چوتھے باب میں اقبال کے تصور ولایت پر بحث چھیڑی گئی ہے۔

۱۰) **اقبال کا تصور امانت:** پانچ ابواب پر مشتمل یہ مقالہ سید محمد فضل اللہ نے پی۔ایچ۔ڈی کے دوران پروفیسر نحوی کی رہنمائی میں پایہ تکمیل کو پہنچایا۔ چوتھا باب مقالے کا بنیادی باب ہے اس میں اقبال کے اشعار و افکار کے حوالے سے تصور امانت کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

۱۱) **اقبال کا تصور انسان:** امیر حمزہ نے ایم۔فل کے لئے یہ مقالہ پروفیسر نحوی اور محمد یونس گیلانی کی مشترکہ نگرانی میں تیار کیا۔ یہ مقالہ چار ابواب پر مشتمل ہیں۔

۱۲) **اقبال کی شاعری میں تصور اہل بیت:** اشتیاق حسین وانی نے ایم۔فل کے لئے یہ مقالہ پروفیسر نحوی کی نگرانی میں تحریر کیا ہے۔ مقالے کے باب اول میں اہل بیتؑ کے مقام پر بحث کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں اردو شاعری میں اہل بیتؑ کے ذکر کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں اقبال کی اردو اور فارسی شاعری میں اہل بیتؑ کے موضوع پر گفتگو کی گئی ہے۔

۱۳) Iqbal,s concept of state: یہ مقالہ پیرزادہ غلام رسول نے ایم۔فل کے دوران بشیر احمد نحوی اور ڈاکٹر عبدالرشید بٹ کی مشترکہ زیر نگرانی میں تیار کیا

ہے۔

۱۴) پروفیسر عبدالمغنی کی اقبال شناسی، ایک مطالعہ: پروینہ حبیب نے ایم فل کے لئے یہ مقالہ پروفیسر بشیر احمد نحوی کی نگرانی میں تیار کیا۔ باب اول میں پروفیسر عبدالمغنی کی شخصیت اور عہد پر بحث ہے۔ دوسرے باب میں اردو ادب میں اقبال شناسی کی روایت پر گفتگو کی گئی ہے۔ تیسرے باب میں پروفیسر عبدالمغنی کی اقبال شناسی کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

۱۵) اقبال کی شاعری میں اولیا و مشائخ: پروفیسر نحوی کی نگرانی میں لکھا گیا یہ ایم۔فل کا مقالہ ریحان الحق نے تحریر کیا ہے۔ پیش لفظ کے علاوہ یہ مقالہ تین ابواب پر مشتمل ہیں۔ آخری باب میں اقبال کی اردو شاعری میں اولیاء و مشائخ کے زیر عنوان امام غزالیؒ، فریدالدین عطارؒ، نظام الدین اولیاؒ، معین الدین چشتیؒ، حکیم سنائیؒ، بایزید بسطامیؒ، اویس قرنیؒ، جامی، جنید بغدادیؒ اور مجددالفِ ثانی کے روحانی مرتبے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱۶) پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی اقبال شناسی: پروفیسر بشیر احمد نحوی کی نگرانی میں لکھا گیا یہ ایم۔فل کا مقالہ صغیرا صاحبہ نے تحریر کیا ۔ یہ مقالہ تین ابواب پر مشتمل ہے۔

۱۷) اکبر اور اقبال کی تنقید مغرب: پانچ ابواب پر مشتمل مقالہ پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے محمد شمیم نے پروفیسر نحوی کی نگرانی میں تیار کیا۔

۱۸)اقبال کا تصور نسواں: نصرت جبین نے پی۔ایچ۔ڈی کے اس مقالے کو پروفیسر بشیر احمد نحوی کی نگرانی میں تحریر کیا ہے۔مقالے کے پہلے باب میں تاریخ عالم میں تصور نسواں پر گفتگو کی گئی ہے۔دوسرے باب میں اسلام میں تصور نسواں پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔تیسرے باب میں اردو شاعری میں تصور نسواں کا اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔چوتھے باب میں اقبال کے آئینے میں تصور نصواں پر بحث کی گئی ہے۔

۱۹) پروفیسر مرغوب بانہالی بحیثیت اقبال شناس: یہ مقالہ پیر نصیر احمد نے پروفیسر نحوی کی نگرانی میں ایم۔فل کے لیے ضبط تحریر میں لایا۔اس مقالے میں چار ابواب ہیں۔

۲۰)اقبال کی شعری اور نثری تصانیف میں سیاسی عناصر: اس موضوع پر پیر نصیر احمد نے پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ پروفیسر نحوی کی رہنمائی میں پایہ تکمیل کو پہنچایا۔اس مقالے میں پانچ ابواب ہیں۔

اس کے علاوہ کئی اور اسکالر پروفیسر بشیر احمد نحوی کی نگرانی میں ایم۔فل اور پی۔ایچ۔ڈی کے مقالے ضبط تحریر کرنے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔

تحقیق وتنقید:

پروفیسر بشیر احمد نحوی ایک ایسے محقق اور نقاد ہیں جن کی ساری زندگی اسی دشت کی سیاحی میں گزری۔انہوں نے جو کچھ لکھا اس کا اہم حصہ ان کی تحقیقی وتنقیدی تصانیف پر مشتمل ہے۔

اس کے علاوہ تالیفات اور مضامین، جن میں بعض تاثراتی اور بعض ہلکے پھلکے صحافتی نوعیت کے شامل ہیں۔ان کی تصانیف اور تالیفات کی فہرست مندرجہ ذیل ہیں۔

تصانیف: نظریہ تصوف اور اقبال' اقبال عرفان کی آواز' اقبال ایک تجزیہ' وحدت الوجود اور اقبال' اقبال افکار و احوال' محسوسات' احساس و ادراک۔

تالیفات: اقبالیات مجلہ شمارہ ۱۲ تا ۲۰' وہ دانائے سبل ختم الرسلؐ نفحات اقبال' اقبال بحر خیال' حکیم مشرق' اقبال کی تجلیات' بیاد شوریدہ کاشمیری' اقبال گزشتہ دس سال' بیاد خواجہ امین بچھ' تاریخ الانبیائ' فکر آزاد' ارمغان نحوی' Iqbal,s religious philosophical ideas' Iqbal,s ideas of self' Iqbals multiformity

آیئے اب پروفیسر نحوی کی تحقیقی و تنقیدی نگارشات کا جائزہ لیتے ہیں

نظریہ تصوف اور اقبال:

یہ تصنیف دراصل بشیر احمد نحوی کا پی۔ایچ۔ڈی مقالہ ہے جو انہوں نے پروفیسر آل احمد سرور اور ضیاء الحسن فاروقی کی مشترکہ نگرانی میں ضبط تحریر میں لایا۔ڈاکٹر پیر نصیر احمد اس مقالے کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''گیارہ ابواب پر مشتمل اس پر مغز مقالے میں تصوف سے متعلق
> مختلف نظریات بالخصوص وجود و شہود کے نظریہ پر ایک تسلی بخش
> بحث کی گئی ہے۔تصوف کے حوالے سے اقبال کے وقتاً فوقتاً کئے

گئے شدید ردعمل کا بھی تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔'' ۵۶۔

ڈاکٹر بدرالدین بٹ لکھتے ہیں:

''اقبال کے دل و دماغ میں صوفیاء کے کس گروہ اور تصوف کی کس شاخ یا سلسلے کا احترام موجزن تھا اور اس کے کیا اسباب و محرکات تھے اس پر بھی اس مقالے میں روشنی ڈالی گئی ہے۔''

۵۷۔

اس مقالے کا پہلا ایڈیشن ''مسائل تصوف اور اقبال'' کے عنوان سے مئی ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا۔ جب کہ اسی مقالے کو میزان پبلی شرز بٹہ مالو سرینگر کشمیر نے ''نظریہ تصوف اور اقبال'' کے زیر عنوان دوبارہ شائع کیا ہے۔ اس کتاب کے حرف آغاز میں پروفیسر بشیر احمد نحوی یوں رقمطراز ہیں:

''نظریہ تصوف اور اقبال'' کی اشاعت پر اس بات کی وضاحت ضروری محسوس ہوتی ہے کہ ہمہ پہلو شخصیت اور اس شخصیت سے وابستہ افکار و تصورات میں نظریہ تصوف اپنی انفرادیت کا حامل موضوع ہے متعدد اصحاب علم و قلم نے اس موضوع پر اپنے اپنے منفرد انداز میں وضاحت کی ہے لیکن موضوع اس قدر سنجیدہ اور ہمہ گیر ہے کہ اس پر مزید غور و فکر کرنے کے امکانات موجود ہیں۔ اقبال خالص اسلامی تصوف کے حامی تھے اور تصوف میں تمام غیر

اسلامی عناصر کو زائل کرنے میں بڑی دلچسپی رکھتے ہیں۔ راقم نے اس کتاب میں ان تمام امور کو زیر بحث لانے کی کوشش کی ہے اور اس سلسلے میں اقبال کا ردعمل کیا رہا ہے اس پر اظہار رائے کیا گیا ہے۔'' ۵۸ ؎

اس کتاب کے طبع اول میں شامل بشیر احمد نحوی کا لکھا ہوا پیش لفظ ہے۔ اس میں بشیر احمد نحوی اس موضوع کی اہمیت اور پیچیدگی پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تصوف کے کثیر الابعاد موضوع پر مشرق و مغرب کے علماء اور صوفیاء نے مدلل اور مفصل کتابیں سپرد قلم کی ہیں۔ مذکورہ موضوع دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ قدرے پیچیدہ بھی ہے۔ اس موضوع کو اقبال کے فکری اور شعری سفر میں اہم سنگ راہ کی حیثیت حامل ہے۔ چنانچہ اقبال نے اپنے نظم ونثر میں تصوف کے بطن سے جنم لینے والے بیشتر مسائل و امور اور اطراف و جہات کی بالتفصیل وضاحت کی ہے۔ میں نے اس کتاب میں تصوف سے متعلق ان مختلف نظریات بالخصوص وجود و شہود کے نظریے سے تفصیلی بحث کی ہے اور اس سلسلے میں علماء و صوفیاء کی گراں بار آرا کا نچوڑ پیش کیا ہے۔ چنانچہ جزئیات میں الجھنے سے بچ کر اقبال کے اس شدید ردعمل کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے جو انہوں نے

> تصوف کے حوالے سے وقتاً فوقتاً ظاہر کیا ہے۔اقبال کے دل و دماغ میں صوفیا کی کس شاخ یا سلسلے کا احترام موجزن تھا اور اس کے کیا اسباب ومحرکات تھے اس پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے تصوف میں کئی امور متنازع رہے ہیں جن پر علماء کے درمیان بڑی تلخ نوائی ہوتی رہی ہے میں نے ان امور میں صرف وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے تعلق سے حضرت ابن عربی اور حضرت مجدد الفِ ثانی کے خیالات کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔'' ۵۹ ؎

واضح رہے کہ یہ پیش لفظ اس کتاب کے طبع اول میں شامل ہے، جب کہ طبع دوم اس سے خالی ہے۔

اس کتاب میں بشیر احمد نحوی نے سب سے پہلے تصوف کی تعریف میں مختلف علماء وفضلاء کی آراء سے مدد لی ہے اور اس کے تاریخی پس منظر کا جائزہ پیش کرتے ہوئے صوفیاء کرام کے مختلف گروہوں پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ان گروہوں کے حوالے سے پروفیسر بشیر احمد نحوی لکھتے ہیں:

> ''خلافت راشدہ اور سانحہ کربلا کے بعد جو دوسرے واقعات ظہور پذیر ہوئے' ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے امت میں ایسے علماء اور صوفیاء کا ایک گروہ پیدا کیا۔۔۔صوفیائے کرام کا دوسرا گروہ اس وقت سامنے آ گیا، جب یونان کے عقلیت پسند فلسفے

نے شریعت اسلامیہ کی بنیادوں کو متاثر کرنے کی کوشش کی ۔۔۔
صوفیائے کرام کا تیسرا گروہ دسویں صدی عیسوی سے متعلق ہے۔
یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمان فقہی مسائل و معاملات کی پیچیدگیوں
میں الجھ کر اپنی منزل اور اصل کو بھول چکے تھے۔'' ۶۰؎

پروفیسر بشیر احمد نحوی نے اس کتاب میں یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح تحریک تصوف نے، کن کن حالات اور کن کن منزلوں سے گزر کر نشوونما پایا، اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ تحریک کس طرح اپنی اصلیت کو مسخ کر کے نقطہ انحراف میں پڑ جاتی ہے۔ اپنے بیان کے تائید میں بشیر احمد نحوی لکھتے ہیں:

''تصوف تصفیہ اخلاق، تزکیہ باطن کی صفات پیدا کرنے اور انہیں
پروان چڑھانے کے لئے وجود میں آیا تھا، رفتہ رفتہ اپنی اصلیت
اور حقانیت سے ہٹ کر نقطہ انحراف کی طرف بڑھنے لگا۔ تصوف
کے ساتھ ایسے لوگ بھی وابستہ ہو گئے جو علم و عمل اور تقویٰ و
طہارت سے عاری تھے اور انہوں نے ایسی اصطلاحات گھڑ لیں
جو براہ راست قرآن مجید اور سنت نبویؐ کے ساتھ متصادم تھیں
اسلام نے عبادات کے جو قاعدے مقرر کر لئے ہیں ان لوگوں
نے ان قاعدوں کا ہی تمسخر اڑانا شروع کیا اور اس طرح شریعت
کے فرائض و احکام سے لاتعلقی کا ماحول پیدا ہونے لگا۔'' ۶۱؎

بشیر احمد نحوی نے اپنی کتاب میں فارسی کتاب ''کشف المحجوب'' اور صوفیاء کے مختلف فرقوں کے بارے میں سیر حاصل تفصیل دی ہے۔ دراصل یہ کتاب (کشف المحجوب) پانچویں صدی کے ایک بزرگ سید ابوالحسن علی ہجویریؒ کی تصنیف ہے، جو صوفیوں کے لئے ایک تبرک ہے جسے صوفی لوگ بغیر وضو چھونا معرد گناہ سمجھتے تھے۔

بشیر احمد نحوی اپنی کتاب میں سلاسل تصوف کا تعارف کراتے ہیں۔تصوف وطریقت نے جب ایک فکری نظام اپنایا اور متعدد صوفیاء و مشائخ نے اپنی مخلصانہ کوششوں کے ذریعے اس نظام کی بنیادوں کو استواری عطا کی، تو آہستہ آہستہ تصوف کے کئی سلسلے وجود میں آنے لگے اور ہر سلسلہ اپنے مخصوص طریقہ عمل ونصاب میں شریعت کے ساتھ مطابقت رکھتے ہوئے لوگوں کی مذہبی و اخلاقی رہنمائی کا فریضہ حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیتا رہا۔ بشیر احمد نحوی لکھتے ہیں:

> ''سلاسل جو معرض وجود میں آ گئے ان میں پانچ سلسلوں کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوگئی۔ وہ پانچ سلسلے حسب ذیل ہیں: سلسلہ نقشبندیہ، سلسلہ قادریہ، سلسلہ چستیہ، سلسلہ سہروردیہ، سلسلہ کبرویہ۔'' ۶۲۔

اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پروفیسر بشیر احمد نحوی تصوف سے متعلق غلط فہمیوں اور شبہات کے سلسلے میں اکابرین کی آراء اور مباحث اور اس سے جڑی غلط فہمیوں کے ضمن میں ایک سیر حاصل جائزہ پیش کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں، کہ اسلامی نظریہ توحید کے

مطابق بھی حق تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے اور کائنات کی ہر چیز ذات میں شامل ہے اور اسلامی نظریہ وحدت الوجود کی رو سے بھی ذات حق ہر جگہ موجود ہے اور کوئی چیز اس سے علٰحیدہ نہیں ہے۔اس لئے نظریہ وحدت الوجود اور اسلامی نظریہ توحید کے مابین کوئی نزاع یا اختلاف نہیں ہے۔اسلامی نظریہ توحید Monothesim کے خلاف جو نظریہ وحدت الوجود ہے وہ غلط قسم کا عیسائی اور ہندوانہ نظریہ وحدت الوجود ہے جس میں جز وکو بھی کل کا درجہ دے دیا گیا ہے اور قطرہ کو بھی سمندر بنا دیا گیا ہے حالانکہ قطرہ اگرچہ سمندر کا ایک ادنیٰ حصہ ہے' سمندر ہرگز نہیں کہلایا جاسکتا ہے۔

اس طرح یہ کتاب اپنے اصل موضوع کی اور بڑھتی ہے یعنی ''اقبال اور نظریہ وحدت الوجود'' اس کے ذیل میں پروفیسر موصوف تصوف کے روایتی نمونے پیش کرتے ہوئے اقبال کے اجتہادی نظریہ تصوف تک پہنچتے ہیں۔ چنانچہ اقبال نے جو وحدت الوجود کا نظریہ پیش کیا ہے، اس سے اکثر علماء نے اختلاف ہی ظاہر کیا ہے۔اس حوالے سے پروفیسر نحوی لکھتے ہیں:

> ''الغرض علامہ کے یہاں کہیں وحدت الوجود کا انتہائی نظریہ نہیں ملتا۔ان کے کلام میں اگر کہیں کہیں وحدت الوجودی رنگ نظر آتا ہے تو اس میں ایک اعتدال ہے اور یہ توحید خالص یا وحدت شہودی کے منافی نہیں، بلکہ موافق ہے۔''۶۳ ؎

پروفیسر قدوس جاوید اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''تصوف سے متعلق اقبال کے اجتہادی تصورات سے علماء نے

اگر اتفاق سے زیادہ اختلاف کیا ہے تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے
کہ اقبال شاعر اسلام ہونے کے ساتھ ساتھ مشرق خصوصاً برصغیر
کی بیداری اور تعمیر نو کے شاعر بھی ہیں اور تصوف سمیت جتنے بھی
مذہبی، سیاسی، سماجی، ثقافتی اور اقتصادی نکات پر اقبال نے خیال
آرائی کی ہے اپنی اس ہمہ جہت حیثیت سے کی ہے ایک منفرد اور
اجتہادی انداز کے ساتھ۔ البتہ یہ منفرد رویہ اور اجتہادی انداز
اس غیر معمولی تاریخی، عمرانی، ثقافتی اور فنی شعور سے عبارت ہے'
جو اقبال کے یہاں اسلامی ہندستان اور یورپی نظریات، حیات
اور اقدار و روایات علم و فن کے بصیرت مندانہ تجزیہ و تحلیل کے
نتیجے میں وجود میں آیا تھا۔'' ۶۴ ؎

علامہ اقبال نے تصوف کے روایتی تصورات کے خلاف جو شدید ردِ عمل ظاہر کیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ غیر اسلامی اور توحید خالص کے منافی تھا' حالانکہ اقبال ابتدا میں وجودی تھے لیکن قرآنِ مجید پر تدبر کرنے سے ان کے سامنے یہ بات واضح ہوگئی کہ بعض اکابر صوفیاء کے عقائد و مسائل قطعاً غیر اسلامی ہیں جیسے مسلئہ وحدت الوجود؛ یہ اسلامی مزاج یا قرآنی نقطہ نگاہ سے توحید کے منافی ہے۔ یہی خرابی وجودی یا روایتی تصوف کے دیگر عقائد و مسائل میں بھی ہے۔ پروفیسر بشیر احمد نحوی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''اقبال موحد ہے اور توحید میں کسی قسم کے اشتراک کو گوارہ نہیں

کرتا۔ مسلمانوں میں جو بعد میں وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی بحثیں چھڑ گئیں ۔ اقبال کے نزدیک یہ بحثیں دینی بحثیں نہیں، بلکہ فلسفیانہ مسائل و مباحث ہیں ۔ اسلام میں توحید کے مقابلے میں فقط شرک ہے ۔ وحدت و کثرت کی بحث اسلامی بحث نہیں اور نہ ہی اشاعرہ اور معتزلہ کے یہ کلامی مباحث، اصل اسلام سے کچھ تعلق رکھتے ہیں ۔ وحدت ذات کے اندر کثرت صفات الٰہیہ عین ذات ہیں یا غیر ذات ۔ اس کے نزدیک خدا ایک نفس کلی یا ایک انا ہے' انائے کامل و مطلق خدا ہے ۔ اس کی عینی اور اساسی صفت خلاقی ہے ۔ کل یوم ھو فی شان ؛ کے معنی اقبال کے نزدیک یہی ہیں کہ اس کی خلاقی مسلسل اور لا منتہاہی ہے ۔ کن فیکون کی صدا ہر لمحے میں آ رہی ہے ۔'' ۶۵ ۔

پروفیسر بشیر احمد نحوی نے اپنی تصنیف ' نظریہ تصوف اور اقبال ' میں مستند اور معتبر حوالوں سے اقبال کے اس شدید رد عمل کو ظاہر کیا ہے جس کا کھلا اظہار انہوں نے شمع اور شاعر میں اور بعد میں اسرار خودی میں واضح طور پر کیا ہے ۔ چنانچہ اسرار خودی عجمی تصوف کے خلاف اعلان بغاوت تھی اور احیاء شریعت اسلامیہ کے لئے ایک نیک کوشش ۔ چنانچہ اقبال اس ضمن میں خود لکھتے ہیں :

''ہندستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر

میں ہیں۔ ان کو عربی اسلام سے اور اس کے نصب العین سے آشنائی نہیں ۔۔ ان کے لٹریری آئیڈل بھی ایرانی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ مثنوی میں حقیقی اسلام کو بے نقاب کروں جس کی اشاعت رسول اللہؐ کے منہ سے ہوئی۔''۶۶۔

اقبال فطری طور پر ملت اسلامیہ اور مشرق کے جدو جہد اور عمل پر ہی فوکس کرتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے وحدت الوجود کی مخالفت کی اور وحدت الشہود کی حمایت کی ۔ دراصل وحدت الوجودی نظریے میں رہبانیت اور بے عملی تھی ۔ پروفیسر بشیر احمد نحوی لکھتے ہیں:

''رہبانیت دنیا کی ہر مستعد قوم میں اس کے عملی زوال کے وقت پیدا ہوتی ہے۔ اس کا مٹانا ناممکن ہے کہ بعض رہبانیت پسند طبائع ہر وقت موجود رہتی ہیں ۔ جو کچھ ہم کر سکتے ہیں وہ صرف اسی قدر ہے کہ اپنے دین کی حفاظت کریں اور اس کو رہبانیت کے زہریلے اثر سے ظ رکھنے کی کوشش کریں۔''۶۷۔

پروفیسر بشیر احمد نحوی نے مسائل وجودی وشہودی کے سلسلے میں بیشتر حوالے ابن عربی اور مجدد الف ثانی سے لئے ہیں اور انہی عمادین کے تقابل میں فکر اقبال کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ اقبال نے خود بھی مسائل وجودی وشہودی پر خصوصی توجہ دی ہیں۔ اقبال کے یہاں ان عمادین کے اثرات نمایاں ہیں۔ اقبال ابتدا میں جہاں مولانا رومی سے متاثر تھے

وہیں مجدد الف ثانی کے خیالات اور اقبال کے خیالات میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ پروفیسر نحوی اس ضمن میں رقمطراز ہیں:

> ''مجدد الف ثانی اور علامہ اقبال کے افکار میں بظاہر جو مماثلت نظر آتی ہے' وہ یہ ہے کہ دونوں کے دل میں ولولہ تھا کہ لوگوں کے خیالات کا رخ اسلام کی طرف پھیرا جائے، دونوں کو اس بات پر اصرار ہے کہ آنحضرتؐ کی ذات گرامی اسوہ کامل اور معیار کمال کی حیثیت رکھتی ہے۔'' ٦٨ ے

بہرحال پروفیسر بشیر احمد نحوی نے اس کتاب میں اپنی محنت شاقہ اور تحقیقی وتنقیدی سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کرتے ہوئے' نظریہ تصوف اور اقبال کے حوالے سے مستند اور معتبر حوالوں سے اس کتاب کو مزین کیا ہے۔ اس کتاب کی اہمیت اور افادیت پر بات کرتے ہوئے سید رسول پونپر لکھتے ہیں:

> ''۔۔۔بشیر احمد نحوی نے مثالی دقتِ نظری اور عرق ریزی سے تصوف کے مسائل کو ممکنہ اور مختلف مآخذ کو کھنگال کر اجاگر کیا ہے۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود یا ہمہ اوست اور ہمہ از اوست کو تاریخی شواہد کی روشنی میں اس طرح بحث کا موضوع بنایا گیا کہ شکوک وشبہات کے بادل از خود چھٹ جاتے ہیں اور طمانیت و تیقن کا سورج ظلمات کے اندھیروں پر ضوفگن ہوتا ہے۔ بشیر احمد

نحوی نے شائستہ گی، باسلیقہ، ہنرمندی اور سرفراز نیاز مندی سے
قرآن و حدیث کی روشنی میں تصوف کے موضوع سے مربوط
بنیادی اصطلاحات کے چہرے سینقاب الٹ کر اصل حقائق سے
شائقین محترم کا رشتہ باندھا ہے یہ بہت بڑی بات ہے جس کے
لئے وہ لائق صد تحسین و آفرین ہیں۔''۶۹؎

۲)اقبال افکار واحوال:

یہ پروفیسر بشیر احمد نحوی کی وہ تصنیف ہے جو ان کے سات مضامین پر مشتمل ہے۔اس میں دو مضامین طویل ہیں اور باقی پانچ مختصر ہیں، جو دراصل ''روزنامہ آفتاب'' سرینگر کے لئے پروفیسر نحوی نے مختلف اوقات میں قلم برداشتہ لکھے ہیں۔ یہ مضامین جنوری ۱۹۸۹ء میں کتابی شکل میں جے کے آفسیٹ پرنٹرس دہلی سے طبع ہو کے شائع ہوئے۔اس کتاب کا انتساب نحوی نے اردو ادب کے ماہر نقاد، محقق، اقبال شناس پروفیسر آل احمد سرور کے نام کیا ہیں۔انتساب میں پروفیسر نحوی رقمطراز ہیں:

''اردو کے مقتدر استاد اور نقاد پروفیسر آل احمد سرور کے نام جن
کی بے لوث محبت اور شفقت سے میرے ارادے مضبوط اور علم
وادب کے ساتھ وابستگی مستحکم ہوگئی۔''۷۰؎

اس کتاب کی اہمیت اورافادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر نحوی خود لکھتے ہیں:

''اقبال۔۔افکار واحوال'' میرے چھوٹے بڑے مضامین کا

مجموعہ ہے ۔ مضامین میں سب سے طول تصوف کے سلسلے میں اقبال کے خیالات والے مضمون نے لے لیا ہے چنانچہ میں نے افراط وتفریط سے بچ کر اقبال کے حوالے سے تصوف کے سلسلے میں ان کے افکار کا تجزیہ کیا ہے اور اس سے قبل تصوف کی تاریخ اور سلاسل پر بحث کی ہے ۔ ویسے یہ اقبالیات میں کوئی بڑا اضافہ نہیں، البتہ اس کوشش اور کاوش کا نتیجہ ہے جو میں فکر اقبال کو گھر گھر عام کرنے کے سلسلے میں حتی الواسع انجام دے رہا ہوں ۔''ا ے

پروفیسر نحوی ان مضامین کے ذریعے اقبال کی وساطت سے عوام الناس میں ذہنی بیداری، روشن ضمیری اور صالح قدروں کی آبیاری کرنا چاہتے ہیں اور محبت انسانی کی قندیل کی' اس آب وتاب کو دکھانا چاہتے ہیں جس کے بارے میں علامہ اقبال نے فرمایا ہے۔ ے

لا پھر اک بار وہی باد و جام اے ساقی
ہاتھ آجائے مجھے میرا مقام اے ساقی
تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے تیرا فیض ہو عام اے ساقی

پروفیسر موصوف کو علامہ کی عظمت اور عالمگیرت کا احساس بھی ہے اور محبت وعقیدت بھی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کے کلام میں ایسی تاثیر ہے جو مردہ جسموں میں جان پھونک سکتی

ہے۔اقبال ایک ہمہ پہلو اور ہمہ جہت شاعر ہیں۔ان کی شاعری حیات و کائنات کے مسائل پر سنجیدگی، گہرائی اور گیرائی سے غور فکر کرنے پر آمادکرتی ہے۔اقبال کے فکر و فلسفہ نے ایک پوری نسل کو متاثر کر دیا ہے۔اقبال کی بلندی کا دائرہ صرف ہندو پاک ہی تک محدود نہیں بلکہ برصغیر کی سیاست پر نظریاتی اور علمی سطح پر جو نقوش علامہ نے چھوڑے، اس نے بڑے بڑے دانشوروں کو متاثر کیا۔ چنانچہ اقبال وہ منفرد اور خوش بخت شاعر ہیں جن پر گزشتہ نصف صدی میں سب سے زیادہ پڑھا اور لکھا گیا۔ برصغیر میں سیکڑوں ایسے لوگ موجود ہیں' جنہیں اقبال کے اردو اور فارسی کلام کا بیشتر حصہ زبانی یاد ہے۔

اس کتاب میں شامل پہلے دو مضامین 'تصوف کیا ہے اور نظریہ تصوف اور اقبال' پر گزشتہ صفحات میں بحث ہوئی ہے۔اس کتاب میں شامل دیگر مضامین مختصر، مقصدی اور اصلاحی نوعیت کے ہیں۔مظہر امام ان مضامین کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر بشیر احمد نحوی کی ایک کتاب ''اقبال ۔۔افکار و احوال'' شائع ہو چکی ہے۔اس کتاب میں تصوف اور نظریہ تصوف اور اقبال' مبسوط عالمانہ مقالے ہیں ۔دوسرے مضامین مختصر' سادہ اور ہلکے پھلکے ہیں شاید اس لئے کہ عوام تک اقبال کے کلام اور پیام کی ترسیل آسان ہو'' ۲۷۔

اس کتاب میں شامل مضمون ''وادیٔ گل اور شعر اقبال'' میں پروفیسر نحوی کشمیر اور کشمیریوں کے تئیں اقبال کے دل میں محبت اور ہمدردی کا نقشہ کھینچا ہے جس نے علامہ کے دل

کو ہمیشہ مضطرب اور بے چین کیا تھا۔ اپنے مضمون میں پروفیسر نحوی لکھتے ہیں:

''وادیٔ کشمیر کے لئے یہ بات باعث فخر ومباہات ہے کہ علامہ انور شاہ لولابیؒ اور علامہ اقبال کا تعلق اسی سرزمین سے ہے اور ان دو مایہ ناز فرزندوں کی بدولت اہل کشمیر علمی دنیا میں اپنا سر فخر وعزت کے ساتھ بلند کر سکتے ہیں۔ اقبال کو کشمیر سے بے حد وابستگی اور وارفتگی رہی، اس سرزمین کی یاد اور اس سے جدائی ان کو بار بار ستاتی رہی اور یہی وجہ ہے کہ کشمیر کی مظلومیت، محکومیت، افلاس، فکری وذہنی بدحالی کا احساس ہمیشہ ان کے دل کو مضطرب اور بے چین کر دیتا ہے۔ اس وادی میں وہ جون ۱۹۲۱ء میں تشریف لائے اور دو ہفتے کے قیام کے دوران یہاں کی سماجی، اقتصادی، سیاسی، معاشی اور سماجی صورتحال کا نقشہ کھینچا۔ درد وکرب اور حقیقت میں ڈھلے ہوئے یہ اشعار ہماری موجودہ سیاسی، سماجی صورتحال پر ٹھیک ٹھاک صادق آتے ہیں

؎

آج وہ کشمیر ہے محکوم ومجبور وفقیر
کل جسے اہل نظر کہتے تھے ایران صغیر

۷۳۔

علامہ کی کثیر الجہت شخصیت نے کشمیر کے اہل علم و دانش کو کافی متاثر کیا ہے۔ جہاں اہل کشمیر کے عالم و دانشور علامہ کو وقتاً فوقتاً اپنی تخلیقات میں گل ہائے عقیدت پیش کرتے رہے' وہاں اقبال کے ذہن میں بھی کشمیر اور اہل کشمیر بسا ہوا تھا۔اقبال نے ایک طرف ہسپانیہ اور اندلس کے زوال پر غم کے آنسو بہائے ہیں' وہیں اپنے آباء واجداد کی سرزمین کی بے بسی اور مظلومیت پر رونا رویا ہے۔اقبال کی اردو، فارسی شاعری میں کشمیر کو ایک اہم مقام حاصل ہے اور آج بھی ٹھیک ٹھیک یہ سرزمین انہی واردات وواقعات سے دوچار ہے جو اقبال کے زمانے میں رونما تھے۔

اس کتاب میں شامل اگلا مضمون اس شعر ''حکیم مشرق کہ نام ہے جس کا۔۔۔ ہر ایک پیر وجواں کا امام ہے ساقی'' کے بہ عنوان ہے۔ اس میں پروفیسر نحوی علامہ کی شاعرانہ انفرادیت اور انقلابی آہنگ و پیغام کو نوع انسانی کے لئے ایک کامل صحیفہ شمار کرتے ہیں جو لوگوں کو خوبیدہ ایوانوں سے جگا کر حیات وکائنات کی مسلمہ قدروں سے آگاہ کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔

پروفیسر نحوی پیغامِ اقبال کو کشمیر کے عوام الناس تک پہنچانا وقت کی سب سے اہم ضرورت سمجھتے ہیں۔ان کے خیال میں کشمیر جس انتشار اور افتراق سے گزر رہا ہے' اسے فکرِ اقبال کے ایقانی جذبے سے نجات مل سکتی ہے۔وہ سمجھتے ہیں کہ کلام اقبال میں وہ تاثیر ہے جو اس کام کو بخوبی انجام دے سکتی ہے۔اس ضمن میں پروفیسر نحوی لکھتے ہیں:

''کشمیر میں اقبال کے پیغام کو عام کرنے کی بڑی ضرورت ہے

اس سلسلے میں مشاعروں، مذاکروں، اور تحریری وتقریری

مقابلوں کا اگر اہتمام کیا جائے اور نئی نسل کو اقبال کے فلسفے سے

آگاہ کیا جائے تو یہ چیز ہمارے معاشرے کو موجودہ انتشار

وافتراق سے یقیناً نجات دلا سکتی ہے'' ۴۷ ۔

اس کتاب میں شامل ایک اور مضمون ''اقبال اور امیر کبیرؒ'' کے عنوان سے ہے۔ اس مضمون میں پروفیسر موصوف نے حضرت امیر کبیرؒ کے تئیں اقبال کی عقیدت مندی کا نقشہ کھینچا ہے۔ شاعرِ مشرق نے اپنی فارسی تصنیف 'جاوید نامہ' میں انتالیس عظیم الشان شخصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی شخصی، فکری اور دینی خصوصیات اور احسانات کو بڑے خوبصورت پیرائے میں سراہا ہے' جس میں حضرت امیر کبیرؒ کا بھی ذکر خیر شامل ہے۔

امیر کبیرؒ ایک انقلابی شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے تین بار کشمیر کا سفر کیا اور غالباً کشمیر میں شافعی مسلک کے وہی سب سے پہلے پیروکار تھے۔ انہوں نے یہاں خانقاہیں تعمیر کروائیں' جن میں سب سے بڑی خانقائے معلیٰ ہے۔ ان خانقاہوں میں قرآن، حدیث، فقہ، تاریخ اسلام کی تعلیم دی جاتی تھی۔ انہوں نے کشمیری مسلمانوں میں اخوت کی جوت جگائی۔ پروفیسر نحوی لکھتے ہیں:

''حضرت امیر کبیرؒ ایک مبلغ اور مجاہد ہونے کے علاوہ صاحب طرز

ادیب اور شاعر بھی تھے۔ چنانچہ آپؒ نے ''ذخیرۃ الملوک'' لکھ

کرعلمی دنیا میں ایک کارنامہ چھوڑا اور یہاں کشمیر کے مسلمانوں کو

''اورادفتحیہ'' کے ذریعے اسلام، رسالت، اخوت اور ہمہ گیر

محبت کا درس سکھلایا۔'' ۵۷؎

علاوہ ازیں اس کتاب میں ایک مختصر مضمون، اقبال پر چند مشاہیر کی آراء، یوم اقبال مورخہ ۹ نومبر ۱۹۸۶ء کی ایک مختصر رپوٹ اور صاحب کتاب مختلف اصحاب کی نظر میں شامل ہیں۔

الغرض پروفیسر نحوی اپنی اس تصنیف سے اپنی خوبیدہ قوم کو جگانا چاہتے ہیں۔ جس طرح اقبال اپنے دور میں ملت کی زبوں حالی سے دلبرداشتہ تھے اور اس کا ہر طرح سے مداوا کرنے کی کوشش میں تھے' ویسے ہی ان مضامین میں پروفیسر نحوی اپنی قوم کے افراد کو اپنے شاندار ماضی کی روایت کو دہراتے ہوئے انہیں یقینِ محکم اور عمل پیہم کی دعوت دیتے ہیں۔ اس دعوت میں انہیں کلام اور پیام اقبال ہی سب سے موثر اور آسان ذریعہ نظر آتا ہے۔ جس کی رغبت اور تاثیر سے نوجوانوں میں فکر اور عمل کا مادہ دوبارہ زندہ کیا جا سکتا ہے۔

۳) اقبال عرفان کی آواز:

یہ کتاب ۲۰۰۲ء میں شالیمار پریس سے طبع ہو کر شائع ہوئی۔ اس کتاب کا انتساب مصنف نے پروفیسر محمد یٰسین صاحب قادری (مشہور ماہر اقبال اور سابق وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی) کے نام اس شعر کے ساتھ کیا ہے۔ ع؎

نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو

رزم ہو یا بزم ہو پاک دل وپاکباز

اس کتاب کے مقدمے میں پروفیسر موصوف اقبال کے فکرونظراور پیغام کے تیئں اپنے تعلق خاص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہیں۔اس کی تائید میں سید رسول پوپنپر رقمطراز ہیں:

''یہ بیان حرف بحرف صداقت پر مبنی ہے کیونکہ جس علمی و ادبی ماحول میں بشیر احمد نحوی نے آنکھ کھولی اس کا لازمی اور فطری تقاضا بھی یہی تھا کہ وہ قرآن وسنت کی روشنی میں علامہ اقبال کی ہمہ جہت و ہمہ گیر اور نابغہ روزگار بصیرت افروز شخصیت اور ان کے عدیم المثال حیات آفرین شعری کارناموں کو اپنا تحقیقی مشن بنا لیں'' ۶۷؎

یہ کتاب پروفیسر نحوی کے ان نو مضامین پر مشتمل ہے' جو وقتاً فوقتاً مختلف رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ یہ مضامین تفہیم اقبال کی ایک کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پروفیسر موصوف نے ان مضامین میں نہایت ہی قلبی وابستگی اور عقیدت کا اظہار کیا ہے۔اس اظہار میں ان کے محسوسات کی پوری دنیا آب وتاب کے ساتھ جلوہ افروز ہے۔اس کتاب کے حوالے سے پروفیسر نحوی خود لکھتے ہیں:

'' زیر نظر کتاب ''اقبال۔۔۔عرفان کی آواز'' میرے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً مختلف رسائل کے لئے لکھے گئے ہیں۔ یہ میری آرزو تھی کہ ان بکھرے مضامین کو یکجا کر کے کتابی

شکل میں شائع کروں۔۔۔اس کتاب کے مضامین جہاں توحید وجودی کے مسائل سے متعلق ہیں وہیں اکابرین دین وادب کی اقبال شناسی بھی ان میں زیر بحث آچکی ہے'' ۷۷۔

ڈاکٹر سید فضل اللہ اپنے ایک مضمون میں اس کتاب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر صاحب کی دوسری تصنیف ''اقبال عرفان کی آواز'' ادب میں وہ اضافہ ہے جو عاشقانِ اقبال، رہ روانِ سلوک اور طالبانِ آگہی کے لئے علامہ بے بدل شاعر مشرق کی شناخت کا سامان کئے ہوئے استاد کی طرح طالب علم کی انگلی پکڑ کر منزل کا رخ کئے ہوئے انوار عرفان سے منور کرتی ہے یہاں پر آکر ڈاکٹر صاحب کے قلم کے کرتب کی گہرائی وگیرائی کا قائل ہونا پڑتا ہے''

۷۸۔

ے

اس کتاب میں شامل پہلا مضمون ''اسرار ورموز میں قرآنی آیات کا استعمال'' کے زیر عنوان ہے۔ اقبال کے پورے نظام فکر ونظر کا محور قرآن پاک ہے۔انہوں نے اپنے اردو اور فارسی کلام میں جابجا قرآنی آیات کا سہارا لے کر اپنے خیالات کی ترسیل وتشہیر کی ہے اقبال اپنی تخلیق اسرار خودی اور رموز بے خودی میں قرآنی تلمیحات ،قرآنی آیات کا جابجا استعمال کر کے ملت کو توحید، اخوت اور محبت اسلامی کا درس دیتے ہے۔آپ نے براہ راست

قرآنی آیات کو صوری و معنوی محاسن کے ساتھ اپنے اشعار میں کہیں مجمل اور کہیں مفصل طور پر استعمال کیا ہے۔ علامہ کی ان خصوصیات کو مدنظر رکھ کر پروفیسر نحوی اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

''اسرار خودی اور رموز بے خودی میں متعدد آیات کریمہ کے ذریعہ فلسفہ اخوت و محبت اسلامی کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب نبی کریمؐ نے دس ہزار قدسی صفات افواج کے ساتھ فتح مکہ کیا تو آپ اپنے دیرینہ دشمنوں سے اس موقعہ پر انتقام لینے کی طاقت رکھتے تھے مگر تاریخ اسلامی کے اوراق گواہ ہیں کہ آپ نے مکہ میں فاتحانہ داخلہ پاتے ہی عام معافی کا اعلان فرمایا اور وہی سلوک روا رکھنے کا وعدہ کیا جو حضرت یوسفؑ نے اپنے سوتیلے بھائیوں سے کیا تھا جو ایک وقت اس کو کنویں میں ڈال چکے تھے حضرت یوسف نے ان سے کہا تھا 'لاتثریب علیکم الیوم یغفر اللہ لکم وھوارحم الراحمین'۔ اقبال اس واقعہ کو یوں سمیٹے ہیں؛ ع ۔

آنکہ براعداء رحمت کشاد

مکہ را پیغام لاتثریب داد

۷۹ ۔

اس کتاب میں شامل اگلا مضمون ''اقبال اور توحید وجودی'' ہے۔ اس مضمون میں

اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، کہ ایک طرف اقبال کو اپنے شاندار ادبی وعلمی ورثے سے قربت تھی وہیں دوسری طرف وہ مسلمانوں کی زبوں حالی پر خون کے آنسوں روتے تھے وہ اس کی بحالی اور بھر پائی کے لئے غور فکر کرتے رہے اور آخر کار انہیں ملت میں پائے جانے اوالے ان جراثیم کا اصل سرچشمہ مل گیا انہوں نے اس کے شر سے بچنے کے لئے احتیاتی تدابیر پیش کیں۔ان کی نظر میں مسلمانوں میں یہ سستی ، یہ کاہلی عجمی تصوف سے پیدا ہوئی ہے۔ دراصل وہ توحیدی تصوف کو صحیح طور پر سمجھنے میں غلطی کر بیٹھے ہیں۔اس طرح وہ توحید اور وحدت الوجود کو مترادف سمجھتے ہیں، جبکہ یہ دونوں اصطلاحیں مترادف نہیں ہیں مقدم الذکر کا مفہوم مذہبی ہے اور موخر الذکر کا مفہوم خالص فلسفیانہ ہے۔ پروفیسر نحوی اس ضمن میں رقمطراز ہیں:

''اقبال کے پاس زندگی کی تمام صداقتوں کی کسوٹی قرآن ہے اور تصوف میں سے بھی اس نے وہی چیزیں اخذ کی ہیں جن میں قرآنی نظریہ حیات کی وسعت اور گہرائی دکھائی دیتی ہے۔اقبال کی توحید،توحید قرآنی ہے جو فلسفہ اور متصوفانہ وحدت الوجود سے متمائز ہے۔ وہ انسان کو صاحب اختیار ہستی سمجھتا ہے کیونکہ قرآن اسے افعال پر ایک گونہ قدرت عطا کرتا ہے۔قرآن دنیا و مافیہا کو مایا فریب ادراک نہیں کہتا ۔وہ ایمان اور عمل سے انسان کی خودی کو استوار کرنا چاہتا ہے۔ اقبال صوفیاء کبار کے ساتھ

عقیدت رکھتا ہے لیکن کہیں کہیں اس کو ان کے فکر و نظر کا کوئی پہلو غیر اسلامی اور منافی حیات دکھائی دیتا ہے۔ وہاں اسکی بے باکانہ مخالفت بھی کرتا ہے۔ وہ پیر رومی کا مرید ہے لیکن محی الدین ابن عربی کا مخالف بھی، جس کی کتاب ''فصوص الحکم'' میں اس کو توحید سے زیادہ الحاد نظر آتا ہے۔ وہ بڑی عقیدت سے مجدد الف ثانی کے تصوف کا قائل ہے جس نے تصوف کو دوبارہ شریعت اسلامی سے ہم آغوش کرنے کی کوشش کی'' ۸۰۔

یہاں پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ برسوں تک ادبی حلقوں میں یہ بات زیر بحث رہی کہ اقبال تصوف دشمن ہے جو درست نہیں ہے۔ اس کے برعکس علامہ نے تصوف کی حمایت کی ہے اس ضمن میں انہوں نے پیر رومی، ابن عربی، مجدد الف ثانی کے نظریات تصوف کا بغور مطالعہ کیا اور قرآن مجید کا بھی مطالعہ کیا۔ بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ تصوف کا وہ طرز عمل بدعت ہے جو شریعت اسلامیہ کے منافی ہے۔ پروفیسر نحوی علامہ کے اس پہلو کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

''اقبال تصوف کے کسی بھی پہلو کے خلاف نہیں۔ لیکن تصوف جب فلسفہ بن جاتا ہے تو اقبال اس وقت اس سے انحراف کرتے ہیں۔ تصوف جب تک اخلاص فی العمل رہتا ہے، وہ اس کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں مگر جب وہ شریعت سے علٰحیدگی اختیار کرتا ہے جب وہ

زندگی اور عمل سے فرار سکھاتا ہے جب وہ دنیا اور کار دنیا کو لاحاصل کہنے پر اصرار کرتا ہے تو اس کی روح اس سے منع کرتی ہے''۷۱۔

اس کتاب میں شامل مضمون ''رہا صوفی گئی نہ روشن ضمیری'' اسی نوعیت کا ہے۔اس میں اقبال کے مختلف متقدمات کے تصورات سے ردعمل پر گفتگو ہوئی ہے۔اقبال نے جہاں مشہور صوفی شاعر حافظ شیرازی کے خیالات سے اختلاف ظاہر کیا ہے وہیں اقبال مولانا رومی کے تصورات سے بے حد متاثر تھے اور علامہ نے اس بات کا خود بھی اعتراف کیا کہ ان کے روحانی اور ادبی سفر کے پیر و مرشد مولانا رومی ہی تھے۔پروفیسر نحوی اس حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

''اقبال مولانا روم کے جاندار اور ہمہ گیر تصور عشق ،نظریہ اختیار،فلسفہ جدوجہد،روح اجتماعیت،رجائی لے،اور لب ولہجہ سے بہت متاثر ہوا۔چنانچہ اس کو اپنے روحانی اور ادبی سفر میں اپنا پیر و مرشد بنایا،پیر روم کی صحبت میں جب درمیاں چھ سو سال کا زمانی بعد تھا۔اقبال نے ان سے جو فیوض حاصل کئے ان میں رومی کا تصور عشق قابل ذکر ہے''۸۰۔

اقبال نے اپنے وسیع مطالعے اور گہرے غور فکر سے مولانا روم کے تصور عشق میں توسیع کی اور اس کی وسعت و معنویت میں اور اضافہ کیا اور اسے فروغ بخشا۔

''سرسید اور اقبال ایک جائزہ'' کے عنوان سے اس کتاب میں ایک اور مضمون ہے۔اس میں بشیر احمد نحوی نے اقبال اور سرسید کے مابین مناسبت اور مطابقت پر روشنی ڈالی ہیں۔ پروفیسر موصوف لکھتے ہیں کہ دونوں کے دل اپنے ملک وملت کے لئے فکرمند تھے۔

اقبال کو سرسید سے جو عقیدت تھی' وہ ان کے مقاصد اور فکر وعمل میں مشابہت ومماثلت کی بنا پر ہی تھی۔ دونوں اپنی قوم کے خیر خواہ تھے۔دونوں مسلمانوں کی زبوں حالی سے نالاں تھے،دونوں مسلمانوں کو اپنے علمی و ادبی ورثے پر غور و فکر کی دعوت دیتے تھے،دونوں جد وجہد اور عمل پر یقین رکھتے تھے۔ پروفیسر بشیر احمد نحوی اپنے بیان میں لکھتے ہیں:

> ''دیکھا جائے تو مقاصد اور فکر وعمل کے اعتبار سے اقبال اور سرسید دونوں میں بڑی حد تک مشابہت اور مماثلت نظر آتی ہے۔ سید احمد خان کی طرح اقبال نے رجعت پسندی اور تنگ نظری کے خلاف علمِ جہاد بلند رکھا۔اسلام کے حقیقی اور علمی نظریات پر زور دیا۔سالہا سال سے بند اجتہاد کے دروازوں کو کھول کر اسلام کو اپنے دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔تمام زندہ ،متحرک اور فعال مسلمانوں کی طرح سرسید اور اقبال کی روح پر نظر رکھتے تھے اور محض ظاہری رسوم ورواج کو ملحوظ خاطر نہ رکھتے تھے۔'' ۸۳؎

اس کتاب کے دیگر مضامین میں اقبال کا اصل کا نامہ، رخت بہ کاشمر، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی اقبال شناسی، اقبال شناسی اور جگن ناتھ آزاد، اقبال پر مشاہیر کے منظوم اور منثور نذرانۂ عقیدت بھی خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ حصہ منظوم میں پروفیسر نحوی کی ایک نظم شامل ہے جو غالباً پروفیسر نحوی کا واحد منظوم کارنامہ ہے۔ یہ نظم اقبال کے تئیں ایک عاشق اقبال کی طرف سے گل ہائے عقیدت کا نذرانہ ہے۔ نظم ملاحظہ ہو:

وہ نوا سنج حرم اقبال کا نام ہے
وہ حکیم شرق ہے وہ شاعر اسلام ہے
وہ برہمن زادہ ہندی سابح بحر علوم
محرم حلاج وہ رمز آشنائے پیر روم
بلبل رنگین نوائے گلستان ہندو پاک
جسکے نغموں سے ہوا راز خودی کا پردہ چاک
قوم کے غم میں جو راتوں تھا ہمیشہ اشکبار
جو دنوں میں درد ملت سے رہا ہے بیقرار
گو ہوا تھی تند روشن کرگیا اپنا چراغ
زندگی کا اپنے من میں جس نے پایا سراغ
تجھ میں اے اجڑے چمن ایسی کلی بھی کھل گئی
جس کی خشبو سے فضا میں اک نئی جاں مل گئی

ترجمان رازِ ملت وہ فقیر کج کلاہ
جس نے بخشی اس چمن میں چشم نرگس کو نگاہ

یہ نظم پوری طرح سے پروفیسر نحوی کی اقبال سے عقیدت اور والہانہ محبت کی مثال ہے۔ اس میں پروفیسر موصوف نے اقبال کو نوا سنج، حکیم مشرق، رمز آشنائے پیر روم، بلبل رنگین نوائے گلستان ہند و پاک، فقر کج کلاہ، ترجمان راز ملت جیسے القاب سے مخاطب کیا ہے۔

مجموعی طور پر پروفیسر نحوی نے ان مضامین میں دیدہ ذہنی سے تجزیہ کر کے مختلف عنوانات سے ان مضامین کو صفحہ قرطاس پر رقم کیا ہے۔ ''اقبال کا اصل کارنامہ'' میں کلام اقبال کے پاکیزہ اقدار پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''۔۔۔جہاں تک اردو شعراء کا تعلق ہے تو مجھے اقبال وہ واحد شاعر نظر آ رہا ہے جس کی عظیم شاعری میں زندگی کی رنگینی، اخلاق کی رعنائی، فن کی گہرائی اور اقدار عالیہ کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ اقبال کی شاعری میں گل وبلبل، خال وخط، پرویز وکوہکن اور لیلیٰ ومجنون کی تلمیحات اور استعارات بھی ملتے ہیں مگر ان تلمیحات وتشبیہات سے حرص وہوس کی ترجمانی کے بجائے تقدیس اظہار کا کام لیا گیا ہے۔ اقبال نے عشق کا جو تصور اپنی شاعری میں پیش کیا اس کا تعلق ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت سے ہے'' ۸۴؎

اور ''رخت بہ کاشمیر'' میں لکھتے ہیں:

''مختصراً یہ کہنا درست ہوگا کہ اقبال اپنے وجود کو ہمیشہ کشمیر کے ساتھ وابستہ سمجھتے تھے اور انہیں اس سرزمین کی خوشحالی، سیاسی سر بلندی، علمی آزادی اور ترقی میں گہری دلچسپی تھی۔ کشمیر پر حضرت علامہ کے کافی احسانات ہیں اور یہ فرزندانِ کشمیر پر فرض بنتا ہے کہ ان کے نام اور پیغام سے اپنی نسل کو آشنا رکھیں اور بڑے پیمانے پر ان کے افکار کی اشاعت وترسیل کریں'' ۸۵۔

اس کتاب میں شامل ایک اور مضمون ''اقبال شناسی اور جگن ناتھ آزاد'' میں پروفیسر آزاد کو اقبال کی چلتی پھرتی ڈکشنری کہتے ہیں۔ پروفیسر آزاد اقبال کے ایسے شیدائی تھے، جن کی نظیر پورے برصغیر میں ملنا محال ہے۔ انہوں نے پیغام اقبال کی جو تعبیر وتفہیم کی ہے، اس کی مثال پروفیسر آزاد اپنے آپ ہی ہیں۔ پروفیسر نحوی پروفیسر آزاد کی اقبال شناسی کے قائل ہیں، چنانچہ ان کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''مولانا شبلی نعمانی نے ستر سال قبل پریم چند کے بارے میں لکھا تھا کہ پانچ کروڑ مسلمانوں میں اس کافر کی سی اردو کوئی دوسرا نہیں لکھ سکا، ٹھیک یہی حال جگن ناتھ آزاد کا ہے کہ ہندو پاک میں اقبال اور اقبالیات کا ایسا دوسرا کوئی غیر مسلم ترجمان پیدا نہیں ہوسکا۔'' ۸۶۔

مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ بشیر احمد نحوی کے ان مضامین میں ان کی ناقدانہ بصیرت

سامنے آتی ہے ان کے نظریات نقد میں اعتدال ملتا ہے لیکن بعض مقامات پر عقیدت مندی کی وجہ سے تنقید کم اور توصیف زیادہ ملتی ہے۔ بہرحال انہوں نے سادہ، سلیس اسلوب نگارش اور طرز ادا روا رکھا ہے اور عام فہم زبان میں اپنے پیغام کو بیان کیا ہے ۔جس نور بصیرت کو پروفیسر نحوی عام کرنے کی دھن میں ہیں اس لحاظ سے وہ کامیاب نظر آتے ہیں ۔ ان تمام مضامین میں پیغام اقبال کی تشریح و تفہیم ملتی ہے۔اس کتاب پر مجموعی طور پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر عبدالحق رقمطراز ہیں:

> ''(ڈاکٹر بشیر احمد نحوی) کا ایک اور کارنامہ ''اقبال اور عرفان کی آواز'' ہے جو مختلف اور متنوع مضامین پر مشتمل ہے۔ ان میں گہرے فکری موضوعات بھی ہیں اور عام پسند سے متعلق عنوانات پر بھی سادہ، سلیس اسلوب نگارش سے آراستہ خیالات پیش کئے گئے ہیں' جیسے اسرار و رموز میں قرآنی تلمیحات، اقبال اور توحید وجودی کے ساتھ رہا صوفی گئی نہ روشن ضمیری، رخت بہ کاشمیر وغیرہ موضوعات خاصے پرکشش ہیں۔ یہ مضامین وقتی فرمائش اور ضرورتوں کے تحت لکھے گئے ہیں ۔مگر ان میں پروفیسر بشیر احمد نحوی صاحب کے محسوسات کی دنیا اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اقبال سے ان کی قلبی وابستگی اور ایک گونہ عقیدت کا عکس و اظہار ہر عبارت اور ہر تعبیر کا جوہر بن کر ابھرتا ہے۔تعلق

خاطر کا یہ رشتہ و پیوند اپنے اقرار و اعتراف میں بہت ہی مستحکم ہے
اسی سبب فکر اقبال کی روح بے حجاب نظر آتی ہے یہ شوق و شغف
وقتی یا حادثاتی بھی نہیں اور نہ ہی منصبی فیض کا نتیجہ ہے بلکہ ابتدائی
تحریروں میں بھی اقدار سے یہ والہانہ انسیت بہت نمایاں ہے
قدروں کا احترام بھی انہیں مطالعہ اقبال کے لئے مہمیز کرتا
ہے۔''۸۴ ؎

۴) وحدت الوجود اور اقبال:

پروفیسر بشیر احمد نحوی کی یہ کتاب جنوری ۱۹۹۲ء میں جے کے آفسیٹ دہلی سے طبع ہو کر شائع ہوئی۔ صاحب کتاب نے ابتدا میں ایک مقدمہ لکھا ہے' جو اس کتاب کے موضوع ''وحدت الوجود اور وحدت الشہود'' کے موضوع پر مجموعی طور پر روشنی ڈالتا ہے' اس کے علاوہ انہوں نے اس میں اقبال کے تصوراتِ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کا ایک جامع خاکہ کھینچا ہے۔ اس کتاب کا پیش لفظ وادیٔ کشمیر کے معروف شاعر اور عاشق اقبال' جناب حکیم منظور کا لکھا ہوا ہے' جس میں انہوں نے وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر نحوی کے اس علمی و ادبی کارنامے کو سراہتے ہوئے' ان الفاظ میں مبارک باد دی ہے:

''ڈاکٹر بشیر احمد نحوی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اپنے
بھرپور، تبحر علمی، صدق تجسس اور خلوص تحقیق سے کام لے کر اس

پیچیدہ مسلے کو آسان بنا کر پیش کیا ہے اور علامہ اقبال کے نظریے کو قرآن وحدیث کے رموز کے سمندروں کی غواصی کے ساتھ ساتھ قدیم اور معاصر علماء دانشوروں اور فلسفیوں کی آراء کو بے پناہ کوشش وکاوش کے ساتھ فراہم کر کے واضح کیا ہے اور برحق ثابت کیا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف اس بات کا ثبوت پیش کرتی ہے کہ علامہ اقبال کو علم قرآن اور علم حدیث پر بے پناہ عبور حاصل تھا بلکہ اس امر کی بھی شہادت دیتی ہے کہ خود ڈاکٹر نحوی اس باب میں کچھ کم نہیں، اس کتاب کا ایک قابل ذکر وصف یہ ہے کہ یہ علماء اور طالبان علم دونوں کے لئے کار آمد بھی ہے اور قابل توجہ بھی''۸۸۔

وحدت الوجود اور وحدت الشہود ایک ایسی بحث ہے جو صدیوں سے چلی آ رہی ہے۔ یہ دو متضاد فلسفے ہیں جو ہمیشہ سے علمائے دین اور مختلف مکاتب فکر سے متعلق صوفیوں اور دانشوروں کی توجہ کا مرکوز رہے ہیں۔ان پر فکر کے سیلاب میں دین اور دنیا کی تشریح وتفسیر کے الفاظ ہی نہیں بلکہ معنی بھی بدلتے رہے ہیں مثلاً ابن عربی ،امام غزالی،شنکر اچاریہ، اسپنوزا، ہیگل، علامہ تیمیہ، شیخ سرمد اور دیگر کئی باکمال فلسفیوں، عالموں نے اس کے نکتہ ہائے دقیق کو سلجھانے کی کوشش کی لیکن ایک یا دوسرے فلسفے کی زلفوں کے اسیر ہو گئے۔

وجودی فلسفہ وتصوف نے ذاتِ مطلق کی تہہ تک جانے یا اس کی حقیقت دریافت کرنے

کے لئے بڑے جتن کئے ہیں۔قرآن کریم میں جبکہ ارشاد ہے ''لا تضربوا اللہ الامثال'' اور ارشاد نبویؐ ہے ''تفکروفی کلِ شیء ولاتفکروذات اللہ تعالیٰ (ہرشی کی فکر کرواور اللہ کی ذات کی نہ کرو) کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے بہت برتر و بالاتر ہے۔

حق تعالیٰ (مطلق ذات) قدیم اور واجب الوجود ہے اور کائنات حادث وممکن الوجود ہے۔ یہ ذات مطلق کے اسماء وصفات کی تجلی ہے۔ اس کا وجود عارضی ہے۔ حقیقی وجود حق تعالیٰ کا ہی ہے' یہاں تک کہ وجودیہ اورشہودیہ دونوں متفق ہیں لیکن کہا جاتا ہے کہ وجود ایک ہےاور کائنات موہوم ہے' اس کا وجود نہیں تو اختلاف شروع ہوجاتا ہے۔

دوسری بات جس پر پروفیسر نحوی نے اس کتاب میں مدلل حوالوں سے بحث کی ہے وہ توحید وجودیہ وشہودیہ اور اقبال ہے۔تصوف اور معاملات تصوف اقبال کے اہم موضوعات میں سے رہے ہیں۔ان کے کلام میں اس حوالے سے کافی مواد ملتا ہے،انہوں نے فقر ،سلوک، جذب، ذکر،فکر،صبر،سکر،سرور،مستی،ہستی،عدم،بق،فنا،محبت،عشق کے الفاظ و اصطلاحات کا بار باراستعمال کر کے انہیں مختلف پیرایوں میں پیش کیا ہے۔تصوف کے ساتھ اقبال کا لگاؤ فطری اور آبائی تھا۔اقبال نے ایک طرف اسلامی اور دوسری طرف صوفیانہ ماحول میں آنکھ کھولی۔اپنے والد بزرگوار کے تربیت یافتہ تھے اور کئی درویشوں سے شرف ملاقات حاصل کر کے ان کی صحبت سے بھی فیض یاب بھی تھے۔

تصوف مسلمانوں کے زوال کا سب سے بڑا سبب تھا' جس نے مسلمانوں میں غارنشینی، گوشہ نشینی کوجنم دیا اور یہی عبادت کا مغز ٹھہرا۔ جو دراصل میدان عمل سے فرار تھا۔علامہ نے

اس (تصوف) سے منہ نہیں موڑا' بلکہ اس کی توسیع کی' اسے قرآن وسنت کے آئینے میں پیش کر کے جدو جہد کی دعوت دی۔ پروفیسر نحوی اپنے بیان میں لکھتے ہیں :

''ان تاثرات سے علامہ کی تشخیصِ امراضِ ملت پر بڑی خوب روشنی پڑتی ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے توحید وجودی کی کیوں اس قدر مخالفت کی ۔ اس عقیدہ کی پستی اور مضر اثرات ان پر بخوبی واضح ہو گئے تھے ۔ اسلئے انہوں نے بڑے بڑے صوفیا اور متصوفین کے عقائد کے خلاف توحید اسلامی کے صحیح عقیدے کا اعلان کیا اور اس کے مختلف پہلوؤں اور حقائق کی ترجمانی کے لئے نظم ونثر کو وقف کر دیا۔''۸۹ ۔

اقبال کے پاس تمام صداقتوں کی کسوٹی قرآن تھا اور تصوف میں بھی علامہ نے وہی چیزیں اخذ کی ہیں' جن میں قرآنی نظریہ حیات کی وسعت اور گہرائی دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً تصورِ عشق کو ہی لیجئے ۔ اگر چہ قرآن میں عشق کا تصور نہیں ہے لیکن اشد حُب اللہ'' ضرور موجود ہے جو مومن کی صفت ہے۔ پروفیسر نحوی اقبال کے تصورِ عشق پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''اقبال عشق کو نہایت وسیع معنوں میں استعمال کرتا ہے۔ عشق ہی کی قوت سے انسانی خودی اپنی منزلیں طے کرتی ہوئی نیابت الٰہی کے منصب پر فائز ہوتی ہے اور اس کے زور سے تسخیر کائنات کر کے مشیت الٰہی کو پورا کرتی ہے۔''۸۷ ۔

مجموعی طور پر پروفیسر بشیر احمد نحوی نے مبسوط عالمانہ انداز میں وحدت الوجود اور وحدت الشہود پر بحث کی ہے جس میں انہوں نے مدلل حوالوں سے استفادہ کر کے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے۔انہوں نے اس نازک موضوع کے متعلق اقبال کا رویہ اور ان کے رد وقبول پر بحث کرتے ہوئے ان کے کلام کو بطور حوالہ پیش کیا ہے۔پروفیسر موصوف نے توازن اور تسلسل برقرار رکھنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔انہوں نے جا بجا ساری توجہ وحدت الوجود وشہود پر مرکوز رکھی'اس بحث میں غور فکر کے بیشتر حوالے ابن عربی،مجدد الف ثانی،امام غزالی،مولانا رومی،حافظ شیرازی سے لئے ہیں اور انہی بزرگوں کے خیالات کے تقابلی مطالعہ پر مرکوز رکھ کر اقبال کے اثر ونفوذ کی نوعیت،رد وعمل کا جائزہ لیا ہے۔ڈاکٹر سید محمد فضل اللہ لکھتے ہیں:

> ''پروفیسر موصوف نے اقبال کے کلام کی گھتیاں ایسے سلجھائی ہیں کہ طالب علموں کے لئے اقبال شناسی آسان بن جاتی ہے۔عرفان ذات باری تعالیٰ کی دولت بے کنار سے ملاقات ہوتی ہے حسن اور عشق کے اصلی معنی نظر آتے ہیں اور تحقیق وتلاش کی حق ادائی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔'' ۸۸ے

۵)اقبال ایک تجزیہ:

پروفیسر بشیر احمد نحوی کی یہ کتاب جنوری ۲۰۰۰ء میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سے شائع ہوئی۔یہ کتاب ۹۷ صفحات پر مشتمل ہے جس میں چار مقالے بہ عنوان:فکر اقبال

پر ایک طائرانہ نگاہ، فکر اقبال کی تہذیب و ترتیب کے سرچشمے، فکر اقبال میں خودی کی اصطلاح، اقبال ماہ وسال کے تناظر میں شامل ہیں۔

''اقبال ایک تجزیہ'' میں شامل مضامین کو پروفیسر نحوی نے ۸۹۔۱۹۹۹ء کے درمیانی عرصے میں تحریر کیا ہے۔ بہ الفاظ دیگر یہ مضامین دس برس کی مدت میں وقتاً فوقتاً حسبِ ضرورت لکھے گئے ہیں۔ یہ مضامین کتابی شکل اختیار کرنے سے پہلے ہند پاک کے بعض نامور مجلّات کی زینت بن چکے ہیں۔ ان مقالات سے پروفیسر نحوی کی مشکل پسند طبیعت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے ظاہر ہے کہ ایسے فکر انگیز مباحث پر قلم اٹھانے کے لئے کس قدر عمیق اور غائر مطالعے، فکر ونظر کی وسعت اور پختگی اور غیر معمولی فہم وادراک کی ضرورت ہے، جسے اقبال کا ایک عام طالب علم نہیں بلکہ پروفیسر موصوف جیسے متخصص اقبال ہی پورا کرنے کی استعداد رکھتے ہیں۔ نئے اور تازہ موضوعات کی تلاش اور جستجو کا عمل نحوی کا تخلیقی منصب رہا ہے۔

اس کتاب میں شامل پہلا مضمون ''فکر اقبال پر ایک طائرانہ نگاہ'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں پروفیسر نحوی نے ایسے عناصر و اجزاء پر گفتگو کی ہے، جن سے مجموعی طور پر اقبال کی تشکیل ہوئی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان تصورات و رجحانات اور مقاصد کو پیش کیا ہے، جن کی ترسیل اقبال کو مقصود تھی۔ پروفیسر نحوی لکھتے ہیں:

> ''اقبال کو جن تصورات، رجحانات اور مقاصد کی اشاعت مقصود تھی۔ انہوں نے ان کی روح کو تشبیہوں کے ذریعے اپنی شاعری میں جگہ دی ہے، جو ان کے فکر اور پیغام سے ہم آہنگ ہیں۔ اقبال

ان تشبیہات و استعارات کا جا بجا ستعمال کرتے ہیں جن میں تگ
ودو، کشمکش، سوز و جستجو اور شوق آرزو کے اثرات نمایاں ہیں
۔۔۔ اقبال اپنی اردو اور فارسی شاعری میں ہر جگہ حرکت ،
حرارت، توانائی، طاقت اور جرأت و بے باکی کے علمبردار نظر
آتے ہیں۔ دریا انہیں اسی لئے پسند ہے کہ وہ رواں دواں ہے'
طاقت کی علامت ہے' جہد مسلسل میں ہے اور بے پناہ ہے۔''
۸۹؎

بہرکیف مضمون نگار اپنے خیالات کی ترسیل اور ابلاغ میں کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔ پروفیسر موصوف فکر اقبال کے بنیادی سرچشموں کو کھنگالتے ہوئے ان کی فکر کے بنیادی ماخذ پر گفتگو کرتے ہیں۔ پروفیسر نحوی فکر اقبال میں خودی کی اصطلاح کے معنی و مفہوم بتاتے ہوئے کلام اقبال سے اس کی مختلف جہتوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ چنا چہ لکھتے ہیں:

''اقبال اس لفظ یا اصطلاح سے جو کچھ سمجھتے اور سمجھانا چاہتے تھے'
اسے آسان لفظوں میں یوں ادا کیا جا سکتا ہے کہ قدرت نے ہر
شخص کے اندر جسم و ذہن اور قلب و نظر کی صلاحیتیں اور قابلیتیں
ودیعت کی ہیں یہ صلاحیتیں ہمارے اندر سوئی ہوئی' چھپی ہوئی اور
خام ہوتی ہیں اور ابتداً ہم ان سے نا آشنا اور ناواقف محض ہوتے
ہیں قدرت کا منشاء یہ ہے کہ اپنی ان صلاحیتوں کی تلاش و جستجو میں

نکلیں ، ان کا پتا لگائیں ،اور ان سے آشنائی اور آگاہی پیدا
کر کے انہیں پردہ خفا سے معرضِ شہود میں لائیں ،اس طرح ان کی
گویا ترقی وارتقاء کا سامان پیدا کریں۔''۹۰؎

غرض نحوی نے کلام اقبال کے جملہ محاسن وصفات کا سہارا لے کر ان کے عظیم تصورات کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

اس کتاب کا آخری مقالہ'' اقبال ماہ وسال کے تناظر میں'' ہے ،اس میں اقبال کی زندگی کے سبھی واقعات وحالات اور کوائف کو تاریخی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ مقالہ صفحہ نمبر ۵۴ سے ۹۷ تک شامل ہے۔

مجموعی طور پر پروفیسر نحوی نے ان مقالات میں عرق ریزی اور بڑی محنت کا ثبوت فراہم کیا ہے ۔اپنے خیالات کو آسان زبان میں پیش کر کے عام قارئین کے لئے دلچسپی کا سامان مہیا کیا ہے۔نقد ونظر کے اعتبار سے بھی یہ مقالے حد درجہ متانت واستدلالی نقطہ نظر کے حامل ہیں ۔انہوں نے ایک ناقد ہونے کے علاوہ عاشق اقبال ہونے کا ثبوت پیش کیا ہے' جو بسا اوقات اپنے معشوق کی عقیدت کی رو میں بہہ گیا ہے۔

۶) محسوسات:

بشیر احمد نحوی کی یہ کتاب ۱۹۹۰ء میں شائع ہوئی ۔اس کتاب میں ان کی وہ ابتدائی تحریریں ہیں جو انہوں نے وقتاً فوقتاً روزنامہ'' آفتاب'' کے لئے لکھیں ۔اس کتاب کا انتساب بشیر احمد نحوی نے اپنے والد گرامی خواجہ غلام حسن نحوی کے نام کیا ہے۔ اس کتاب

میں پیش گفتار اور پسِ گفتار کے علاوہ ۲۵ مختصر اور متفرق مضامین ہیں۔ پروفیسر نحوی اس کتاب کے حوالے سے حرف آغاز میں یوں رقمطراز ہیں:

''محسوسات'' میرے بچپن کے داخلی اور خارجی تاثرات، بکھرے خیالات اور جذبات پر مشتمل چھوٹے بڑے مضامین کا مجموعہ ہے۔محسوسات میں ان مضامین کا انتخاب کیا گیا ہے جو روزنامہ'' آفتاب'' سرینگر کے لئے وقتاً فوقتاً لکھے گئے تھے۔۔ مضامین کے مطالعے کے دوران قارئین کئی مقامات پر تسلسل کی کمی محسوس کریں گے اور اسلوب نگارش میں جس ربط وضبط کی ضرورت ہوا کرتی ہے' اس میں تھوڑا ڈھیلا پن انہیں دیکھنے کو ملے گا۔اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ یہ مضامین مختلف حالات ، واقعات سے متاثر ہوکر صحافتی نقطہ نگاہ سے لکھے جاچکے ہیں اور بعد ازاں بالکل اسی صورت میں کتابی شکل میں ڈھال دئے گئے۔''

۹۴ ؎

جیسا کہ اُوپر کے بیان سے صاف ظاہر ہے کہ یہ مضامین صحافتی ضرورت کے پیش نظر لکھے گئے ہیں اور اس طرح ان پر مقصدیت غالب نظر آتی ہے۔ان کی اہمیت پر بات کرتے ہوئے پروفیسر نحوی کا خود کا بیان ہے:

''توقع ہے کہ موجودہ اخلاق سوز دور میں یہ کتاب اسکولوں اور

> کالجوں کے طلبا اور طالبات اور معاشرے کی اصلاح سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے ماضی کی قدروں کا احساس بیدار کرنے اور مستقبل سے آگہی فراہم کرنے میں کسی قدر مدگار ثابت ہوگی۔'' ۹۵۔

اس کتاب میں جناب مظہر امام کا لکھا ہوا پیش گفتار شامل ہے، جس میں مظہر امام نے پروفیسر نحوی کی شخصیت اور ان کے ادبی مزاج پر پر مغز گفتگو کی ہے۔ یہ مبسوط مضمون کئی لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے۔ اس سے نحوی کی شخصیت پر اور ان کی بعض تصانیف پر روشنی پڑتی ہے۔محسوسات کے حوالے سے مظہر امام لکھتے ہیں:

> ''بشیر احمد نحوی اب اپنے ان مضامین کا مجموعہ ''محسوسات'' کے نام سے پیش کر رہے ہیں، جنہیں میں نے صحافتی نوعیت کے مضامین کہا ہے۔ ۔۔۔ بشیر احمد نحوی جو کچھ لکھتے ہیں بغیر کسی مصلحت اور خوف کے لکھتے ہیں۔ ان کی تحریریں مقصدیت اور افادیت کی حامل ہیں'' ۹۶۔

اس مجموعے میں شامل مضامین کو نوعیت کے لحاظ سے تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔صحافتی، ادبی اور مناظر قدرت۔صحافتی مضامین میں اخلاقی و اصلاحی مقصد غالب ہے۔ ان میں انسان کی پستی اور بے بسی کا رونا رویا گیا ہے اس نفسانفسی کے عالم سے نکلنے کی تجویز پیش کی گئی ہے، جو خدا پر کامل بھروسہ اور اسوۂ حسنہ کی مکمل صورت میں ہے۔اس کے نتیجے میں

دارین نصیب ہوسکتا ہے اور اس کی اطاعت سے اجتماعی اخوت کا جذبہ بیدار ہوسکتا ہے۔ ادبی حصہ میں غالبؔ، جوشؔ، آغا شورش کاشمیریؔ، وغیرہ جیسی شخصیات پر مضامین ملتے ہیں۔

پروفیسر نحوی نے ایک طرف جہاں صحافتی و اخلاقی اور ادبی نوعیت کے مضامین لکھے ہیں' وہیں کشمیر کا حسن اور مناظر قدرت انہیں متاثر کئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کی جمالیاتی حسیت نے انہیں ''پہلگام کی سر درات' لداخ کا سفر' دریائے جہلم وغیرہ جیسے مضامین لکھنے پر مجبور کیا۔ انہوں نے جہاں ان مضامین میں کشمیر کے حسن کی تعریفیں کی ہیں' وہیں ان قدرتی مناظر کی زوال پذیری کا ذکر کر کے نام نہاد انسانوں پر چوٹ کی ہے' جو قدرت کے اس کارخانے کو بگاڑنے پر تلے ہیں۔ مظہر امام لکھتے ہیں:

> ''بشیر احمد نحوی نے کشمیر کے صرف حسن پر ہی نظر نہیں رکھی، بلکہ اس کے باطن میں بھی جھانکا ہے۔ تلخ حقائق پر ان کی نگاہ ہے اور وقتاً فوقتاً وہ اپنے اہل وطن کو بھی ان کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔ انہوں نے بہت سے مضامین کے توسط سے اس معاشرے کی زوال پذیری پر جو تنقیدیں کی ہیں وہ غور خوض کا مطالبہ کرتی ہیں۔ انہوں نے جن خطرات سے خبردار کیا ہے' ان سے محفوظ رہ کر ہی یہ خطہ گل اپنی کھوئی ہوئی روح اور تشخص کی بازیافت کرسکتا ہے۔''۹۷؎

۷) احساس و ادراک:

یہ مضامین کا مجموعہ جون ۲۰۱۱ء میں میزان پبلشرز سرینگر کشمیر سے زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے میں پروفیسر نحوی کے ۳۷ مضامین شامل ہیں' جو انہوں نے گزشتہ کئی برسوں میں ریاست کے کثیر الاشاعت اردو روز نامہ ''کشمیر عظمیٰ'' میں رقم کئے ہیں۔ ان مضامین میں جناب نحوی نے ادبی، علمی، دینی، اور ثقافتی مسائل کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش کے پس منظر میں ادب کو زندگی کے ساتھ مربوط کرنے، اسے انسانی خدمات کا وسیلہ بنانے اور قاری کے لئے کھرے اور کھوٹے کے درمیان فرق کرنے کی ایک سعی کی ہے۔ پروفیسر نحوی اس مجموعے کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

> ''احساس وادراک' اقبال کے فکر ونظر اور دیگر سماجی و ثقافتی مضامین کا انتخاب ہے۔۔ ان مضامین کو سپرد قلم کرنے کے پیش نظر صرف ایک جذبہ کارفرما ہے کہ جس معاشرے کا میں فرد ہوں، اس کی ہمہ جہت ترقی، خوشحالی، اور وسعت وکشادگی میں میرا اپنا حصہ ادا ہو اور جو تعلیم و تعلم کا پیشہ ہم نے اختیار کیا ہے، اس کے ساتھ ہر مرحلے پر انصاف ہو۔'' ۹۸؎

پروفیسر نحوی نے اپنا ایڈل اقبال کو بنایا اور اسی کے پیغام کو پیش کر رہے ہیں۔ پروفیسر نحوی ان کی فنی اور فکری جہات کے آئینے میں ان کا پیغام تمام لوگوں تک پہنچانے کے متمنی ہے، ساتھ ہی ساتھ پروفیسر نحوی علامہ کی عاشقانہ زندگی کے حوالے سے لکھتے ہیں۔ علامہ کا عشق، عشقِ محمدؐ کے سوا کچھ نہیں' اور یہی ان کی شاعری کا بنیادی مرکز رہا ہے۔ علامہ عشق کی ہی

بدولت مسلمانوں کی خفتہ و تاریک زندگی میں بیداری اور روشنی کے فانوس جلانا چاہتے تھے پروفیسر نحوی اپنے بیان میں کلام اقبال سے مثالیں پیش کرتے ہیں۔اقبال کی نظم ''ذوق سوق'' میں عشق رسولؐ کی تفصیلی تصویر کشی کی مثال ملتی ہے۔جس سے یہ بات پائے ثبوت کو پہنچتی ہے کہ اقبال نے عشق رسولؐ کے بیان میں عقیدت، جذبات و احساسات اور والہانہ وابستگی کا ثبوت دیا ہے، ساتھ ہی ساتھ یہ حقیقت بھی سامنے لائی ہے کہ اصل سرخروئی اسوۃ حسنہ کی کامل پیروی میں پنہاں ہے۔ پروفیسر نحوی اپنے بیان میں لکھتے ہیں:

> ''عشق کے وسیع تناظر اور ابعاد و جہات میں اقبال نے عشقِ مصطفیؐ کی ترکیب کو مختلف مواقع پر نئے معانی میں استعمال کیا ہے۔''۹۹؎

اقبال کے عشق رسولؐ اور آل رسولؐ سے ان کی عقیدت اور وابستگی کو پروفیسر نحوی ان کی کامیاب زندگی کا خاصا قرار دیتے ہیں۔اقبال کے نزدیک اگرچہ ہر قسم کی موت ایک مومن کے لئے مرعوب وشیرین ہے لیکن فرزندانِ علیؓ کی شہادت ایک منفرد موت ہے کیونکہ اس کے پس منظر میں حق و باطل کی داستان مضمر ہے۔نحوی اقبال کی مشہور فارسی مثنوی ''رموز بے خودی'' میں 'در معنی حیرت اسلامیہ و سر حادثہ کربلا' کے عنوان سے ۱۳۹ اشعار پر طویل تاریخی نظم کی مثال پیش کرتے ہیں جس میں علامہ کی شہدائے کربلا کے ساتھ جذباتی و فکری کیفیات منعکس ہوتی ہیں۔

اس کتاب میں شامل ایک مضمون ''نئی صدی میں شاعر مشرق کی معنویت'' ہے جس میں

پروفیسر نحوی کہتے ہیں کہ اقبال کی نظر میں صحیح فن و ہنر وہ ہے جو ہمارے عزم اور ولولے کو آگے بڑھائے ،فرسودہ ماحول کے خلاف ہمیں بغاوت پر اکسائے ،ایک صالح زندگی کی ترغیب دے' جس کا سارا عمل رضا الٰہی پر کارفرما ہو۔ پروفیسر نحوی اپنے مضمون میں آگے لکھتے ہیں :

''اقبال کے نزدیک دریائے دجلہ اور فرات کا پانی اب بھی اسی انداز میں بہہ رہا ہے،لیکن مسلمانوں کے کاروان میں حسینی کردار کا ایک بھی فرد دکھائی نہیں دیتا ہے۔اقبال دراصل یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جب تک جدوجہد ، جہاد اور شہادت کے پیچھے خلوص، للٰہیت ، ایثار اور رضائے الٰہی کارفرما نہیں ہوں' تب تک یہ عمل بے سود ہے۔'' ۱۰۰؎

شعر اقبال کی فنی وتخلیقی توانائی میں نحوی اقبال کے لہجے کی مردانگی اور رجائیت کے قائل بھی ہیں اور اسے بنیادی حیثیت بھی دیتے ہیں۔ان کے لہجے میں زندگی کی قوت ہے، جو دلوں کو گرماتی ہے اور رجائی لب ولہجہ زندگی بسر کرنے کا عزم اور حوصلہ عطا کرتا ہے۔

عہد حاضر میں علامہ کی اہمیت اور ان کے کلام کی معنویت پر اظہار کرتے ہوئے پروفیسر نحوی نے بعض اہم باتوں کا ذکر کیا ہے' جیسے اقبال نے انسان کے اندر قوت یقین پیدا کرنے کی جو کوشش کی ہے وہ ہماری شاعری میں اولین کوشش ہے۔ان کے خیال میں اقبال اگر اردو فارسی شاعری کو اس موڑ سے آشنا نہ کرتے ،تو آج اردو کے چوٹی کے شعراء کی شاعری کا اندازہ یقیناً مختلف ہوتا۔اسی طرح اقبال نے آزادی کا ایک ایسا تصور پیش کیا'

جس نے آنے والی نسلوں کے لئے منزل کی واضح نشاندہی کردی۔علامہ نے اپنے عہد کے نام جو پیغام دیا، وہ آزادی انسان کا پیغام ہے۔ پروفیسر نحوی کے الفاظ ہیں:

''بیسویں صدی میں ابھرنے والی اقبال کی متحرک ،توانا اور تابندہ فکری شخصیت اکیسویں صدی کے پر آشوب عالمی منظر نامے میں زبردست معنویت رکھتی ہے۔ یہ شخصیت اور یہ فکری وجود موجودہ صدی کو سیاسی ،سماجی، معاشی، معاشرتی بالادستی اور اقوام عالم پر ظلم و تعدی ،حق تلفی اور نا انصافی کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتے ہوئے انسانی اخوت، احترام آدمیت' متوازن تقسیم دولت،تزکیہ قلب و ذہن اور ارتفاع اقدار کے عظیم اصولوں کی ترجمانی کا خوشگوار فریضہ انجام دیتا ہے۔''۱۰۱؎

اس کتاب میں شامل کئی مضامین اقبال اور کشمیر کے حوالے سے ہیں' جن میں مصنف بتاتے ہیں کہ اقبال کو کشمیر کے ساتھ ایک روحانی تعلق تھا۔ان کے اجداد بھی کشمیری تھے۔ اقبال کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا کہ محب کون ہے اور محبوب کون ہے' ذرا مشکل ہے۔ دونوں طرف یکساں جذبہ محبت ہے۔اقبال اپنی نظم ''ساقی نامہ'' میں کشمیر کے شہرہ آفاق باغات کی کامیاب تصویر کشی کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ کشمیریوں کی زبوں حالی، امراء کے ہاتھوں ان کا استحصال اور پھر ان میں تغیر و انقلاب کی آرزو کا اظہار کرتے ہیں۔ پروفیسر نحوی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''پیام مشرق کی نظم ''ساقی نامہ'' جو اقبال نے نشاط باغ میں لکھی ہے۔فنی محاسن کے اعتبار سے ایک شاہکار نظم ہے۔ یہ نظم کشمیر کے منظر اور شہر آفاق باغات نشاط و شالیمار کے گرد و پیش کی نہایت ہی کامیاب عکاسی کرتی ہے۔''۱۰۲ ؎

اس کتاب میں شامل ایک مضمون بہ عنوان ''حضرت امیر کبیرؒ کے بہ حضور شاعر مشرق'' ہے، جس میں پروفیسر موصوف نے اقبال اور امیر کبیرؒ کی ملاقات کے بارے میں لکھا ہے۔ ان دونوں کے درمیان بھرپور مکالمے ہوتے ہے درحقیقت یہ ملاقات زمینی نہیں بلکہ خیالی ہے۔ شاہ ہمدان اور اقبال کی گفتگو ''جاوید نامہ'' کے ایک باب میں درج ہے اقبال اپنا اضطراب کم کرنے کے لئے شاہ ہمدان سے سوالات کرتے ہیں۔کشمیر کی بگڑی ہوئی صورت کے بارے میں پوچھتے ہیں، اور شاہ ہمدان کا بڑا حوصلہ افزا جواب دیتے ہیں۔اس مضمون کے آخر میں پروفیسر نحوی لکھتے ہیں:

''حضرت امیر کبیرؒ کشمیر کے بڑے محسن گزرے ہیں، جنہوں نے اس خطہ ارض کو اسلام کی عظیم نعمت سے بہرہ ور کیا اور اقبال وہ فرزندِ کشمیر ہیں، جنہیں اس سرزمین کی فکری، علمی، اقتصادی اور سیاسی فکر دامن گیر تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ خطہ امن و سکون خوشحالی اور معاشی استحکام کا گہوارہ بن جائے اور یہاں کے لوگ جہالت ، پسماندگی اور جذباتیت سے آزاد ہو کر ایک باعزت زندگی گزار

سکیں۔''۱۰۳؎

الغرض نحوی نے اپنے مضامین میں فکر اقبال کے ساتھ شعر اقبال کے فنی محاسن اور تخلیقی پہلوؤں کو بھی منکشف کیا ہے۔ اقبال پر نحوی کے یہ مضامین یک طرفہ فکری یا فنی مطالعہ نہیں، بلکہ فکر وفن کی وحدت کے ساتھ تخلیقی اکائی کی صورت میں تفہیمِ اقبال کے اساسی نکات کا احاطہ کرتے ہیں۔

اس مجموعے میں چند مضامین کشمیر کی معروف شخصیات شوریدہ کاشمیری، میر غلام رسول نازکی، سلطان الحق شہیدی، خواجہ غلام حسن نحوی (پدر مصنف) پروفیسر قاضی غلام محمد کے حوالے سے ہیں۔ ان مضامین میں پروفیسر موصوف نے ان شخصیات کے فکر وفن پر مختصراً اظہار خیال کیا ہے۔ یہ سبھی شخصیات شعر وادب سے بالواستہ یا برائے راست تعلق رکھتی ہیں اور اپنے اپنے شعبۂ جات میں ماہر بھی ہیں۔ ان کے ساتھ نحوی کی عقیدت مندی ہے' جیسے شوریدہ کی شاعرانہ خصوصیت پر گفتگو کرتے ہوئے یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

> ''داخلیت اور گرد و پیش کی صورت حال کا نقشہ شوریدہ قافیوں میں جدت وندرت بیان کے عجیب ونادر نمونوں کے ساتھ کرتے نظر آتے ہیں۔ قوافی میں رنگینی کا اہتمام کرتے ہیں۔ مایوسی اور افسردگی، یاس اور قنوطیت کے اسلوب میں ڈھلی ہوئی شوریدہ کی بیشتر شاعری کبھی کبھار امید، روشنی، بہتر مستقبل اور خوشگوار تبدیلی کی غمازی بھی کرتی ہے۔ وہ اقبال کے الفاظ میں اپنی ''کشت

ویران'' سے مایوس نہیں بلکہ ''ذرا نم'' ہونے کی آرزو کرتے

ہیں'' ۱۰۴؎

پروفیسر بشیر احمد نحوی ان کی کما حقہ شاعرانہ خصوصیات بیان کرتے ہوئے ان کے کلام کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔اسی طرح نازکی صاحب کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ یہ کشمیر کے مایہ ناز، سخنور، عابد شب زندہ دل، ایک دانشور اور سب سے بڑھ کر ثنا خوانِ رسولؐ ہے۔انکی شاعری، شاعری برائے شاعری نہیں بلکہ معاشرے کی مکمل منظوم مصوری ہے اور نحوی انہیں سعدی شیرازی سے مشابہت دیتے ہیں۔

ایک حقیقی شاعر اپنے گرد وپیش، اپنے وطن اور اس کے وطن پر جو کچھ گزرتی ہے' اس سے بیگانہ نہیں ہوتا، بلکہ اس کی آنکھ اور اس کا قلب وجگر اشکبار رہوتا ہے۔ایسی ہی کیفیات ہمیں سلطان الحق شہیدی کے یہاں ملتی ہیں۔ بقول پروفیسر نحوی شہیدی نصف صدی سے زائد عرصے سے وادیٔ شعروادب میں آبلہ پائی کرر ہے ہیں۔سماج کی قدروں میں تغیر وتبدل روایات کا تنزل اور احساسات میں بغاوت کے اجزا ان کے اشعار میں جھلکتے دکھائی دیتے ہیں۔شہیدیؔ محسوسات کی شدت وحدت کے رقص آتشین میں خود آگہی، خود شناسی اور خون جگر کے لئے کوئی بھی سزا بھگتنے کے لئے تیار ہیں۔

اسی انداز میں پروفیسر نحوی اپنے والد کی شاعرانہ خصوصیات پر گفتگو کرتے ہیں اور ان کی شاعری کو انقلابی شاعری سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہاں پر اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ میر غلام رسول نازکیؔ اور خواجہ غلام حسن نحویؔ کشمیری زبان کے شاعر گزرے ہیں۔خواجہ غلام

حسن نحوی کے انقلابی نغموں، سماجی بیداری کے ترانوں پر بات کرتے ہوئے پروفیسر موصوف ان کی خصوصیات کا یوں تذکرہ کرتے ہیں:

''نحوی صاحب کے کلام پر ایک نظر ڈالنے کے بعد اس بات کا اندازہ ہوجاتا ہے کہ وہ انقلابی مزاج کے سخنور تھے۔ اگرچہ اپنے ساٹھ سالہ علمی، ادبی اور تبلیغی سفر میں انہوں نے ذرائع ابلاغ کا کبھی سہارا نہیں لیا اور اپنے سینے میں دبی اس انقلاب کی آگ کو دبائے رکھی۔'' ۱۰۵؎

اسی صف میں نحوی کے ایک اور ہم عصر قاضی غلام محمد کا نام ہے' جو کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ ریاضی کے استاد تھے۔ پروفیسر موصوف اپنے مضمون میں انہیں ممتاز استادِ ریاضی، معروف شاعر، حافظ کلام غالب کے القاب سے یاد کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ان کی حاضر جوابی، روشن دماغی، بذلہ سنجی، نکتہ رسی، ذکاوت، ذہانت، کا اعتراف کرتے ہیں۔ ان کی ذکاوت اور ذہانت کے حوالے سے نحوی ان کے مقالے omar khayyam and solution of cubic کو ایک شہکار فکری استعداد کا غماز قرار دیتے ہیں۔

پروفیسر بشیر احمد نحوی کے اس مجموعے میں بعض مضامین سماجی نوعیت کے ہیں۔ ظاہر سی بات ہے کہ پروفیسر نحوی نے پیش لفظ میں ان مضامین کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ روزنامہ ''کشمیر عظمیٰ'' میں شائع ہوئے ہیں اور بعد میں انہیں کتابی شکل دے دی گئی۔ ان مضامین میں پروفیسر موصوف سماج کے گرد وپیش میں ہونے والے واقعات پر روشنی ڈالتے ہیں اور یہ

چاہتے ہیں کہ ان کا یہ پیغام سب لوگوں تک پہنچ جائیں تا کہ وہ جان جائے کہ انسان دنیا میں رہ کر کس لئے جیتا ہے اور کس لئے مرتا ہے اور اس کا اصلی منصب کیا ہے۔ انسان جب تک اپنی ذمہ داریوں کو نہ سمجھے گا' تب تک وہ ایک خوشحال معاشرے کا خواب نہیں دیکھ سکتا اور دوسری طرف جو معاشرے میں پنپتی ہوئی افراتفری ، بے ایمانی ،فریبی ، جیسے برے فعل پھیل رہے ہیں' ان کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انسان اپنی ذمہ داریوں سے منہ موڑ چکا ہے' جس کی وجہ سے وہ لگاتار استحصالی قوتوں کے ہاتھوں شکار ہو رہا ہے۔

مجموعی طور پر پروفیسر بشیر احمد نحوی ان مضامین میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جب تک انسان غور وفکر نہ کرے ، اپنے اندر نہ جھانکے گا ، تب تک وہ ظلم کا شکار ہوتا رہے گا ، اس پر مسلسل جبر ہوتا رہے گا۔ نحوی اپنے مضمون تارِعنکبوت میں لکھتے ہیں :

> ''عنکبوتی تاروں کے جال میں آ کر آدمی اپنی فکر کی وسعتوں اور ان صلاحیتوں سے یکسر محروم ہو جاتا ہے' جو اسے تمام مخلوقات میں امتیاز بخشنے کی ضامن تھیں۔ انا پرستی ، خود بینی ، خود غرضی اور مفاد پرستی کے دائروں میں پھنس کر انسان کی زندگی اختتام کی شام کو پہنچ جاتی ہے۔'' ۱۰۶؎

الغرض یہ مضامین اگر چہ وقتی ضرورت کے تحت تحریر کیے گئے ہیں' تاہم صحافتی اور ہنگامی نوعیت ہونے کے باوجود ان میں دائمی اثر و تاثیر موجود ہے' جو ہر صحت مند معاشرے کے لئے مشعل راہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ ان مضامین میں نحوی نے صحیح زندگی کا خواب دکھایا ہے

اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہماری زندگی کس طرح خوشحال رہ سکتی ہے۔انہوں نے فلسفہ زندگی کومختلف زاویوں سے،مگرآسان اورسہل طرز میں پیش کیا ہے۔

تالیفات:

۱)اقبالیات شمارہ ۱۲:

اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی کے زیر اہتمام شائع شدہ اقبالیات کا باروا ں شمارہ دوحصوں پرمشتمل ہے۔حصہ اول میں چھ مقالات ہیں اورحصہ دوم طرحی مشاعرے پر مشتمل ہے،جو ۹ نومبر ۱۹۹۸ءکواقبال انسٹی ٹیوٹ کے اہتمام سے منعقدکیا گیا تھا۔مذکورہ مجلہ کے مدیرادارے کے ڈائریکٹر پروفیسر بشیراحمدنحوی ہیں۔پروفیسرنحوی نے ابتدا میں تمہید کےطور پر''اداریہ''کےعنوان کےتحت اقبال انسٹی ٹیوٹ کی سرگرمیوں پرروشنی ڈالی ہےاس کےعلاوہ مذکورہ شمارے کا تعارف پیش کیا ہے۔

مجلہ کی فہرست مضامین کو مدنظر رکھتے ہوئے جہاں تک مقالہ نگارحضرات کاتعلق ہےان میں پروفیسر حامدی کاشمیری،پروفیسر قدوس جاوید،پروفیسر بشیر احمدنحوی،پروفیسرتسکینہ فاضل،ڈاکٹرصورت جہاں،کےعلاوہ ڈاکٹرمشتاق احمد گنائی اورسیدشبیراحمدقابل ذکر ہیں۔

اس مجلہ کا دوسرا حصہ اس طرحی مشاعرے پرمشتمل ہے جو ۹ نومبر ۱۹۹۸ءکواقبال انسٹی ٹیوٹ کےاہتمام سےمنعقدکیا گیا تھا۔اس مشاعرے میں جن شعراحضرات نے شرکت فرمائی ان میں حامدی کاشمیریؔ،حکیم منظورؔ،مشعل سلطان پوریؔ،اسداللہ آفاقیؔ،غلام نبی ناظرؔ،

رخسانہ جبینؔ، نذیر آزادؔ، محمد یاسین ساگرؔ، محمد عبداللہ منظرؔ، مشتاق کشمیریؔ قابل ذکر ہیں۔

۲) اقبالیات شمارہ نمبر ۱۳:

مذکورہ شمارہ اقبال انسٹی ٹیوٹ سے پروفیسر بشیر احمد نحوی کی ادارت میں ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا۔ مذکورہ مجلہ میں سات مضامین شامل ہیں' جن میں جسٹس علی محمد میر کا اقبال اور تصوف، پروفیسر غلام محمد شاد کا قاضی صاحب چند معاصرین کی نظر میں، غلام رسول آزاد کا اکیسویں صدی میں فکر اقبال کی معنویت۔ شکیل شفائی، غلام محمد خان، حسن زینہ گیری کے مضامین بھی اسی عنوان سے شامل ہیں۔

مجلہ کی ابتدا میں پروفیسر نحوی نے تمہید کے طور پر پیش گفتار لکھا ہے' جس میں پروفیسر موصوف نے اقبال اور اقبالیاتی ادب کے بڑھتے ہوئے دائرہ اثر پر خوشی کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے اس ضرورت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اقبال اور اقبالیاتی ادب کی زبان سہل، عام فہم اور روزمرہ ہو، تاکہ عام آدمی بھی اس ادب اور اسکی رنگا رنگی اور لطافتوں سے محظوظ ہوں۔ پروفیسر نحوی مزید لکھتے ہیں کہ موجودہ پرآشوب دور میں جہاں ہمارا معاشرہ قدروں سے خالی ہے، احترام آدمیت دم توڑ رہی ہے' ایسے میں اقبال اور اقبالیاتی ادب ایک ایسی روشنی ہے جو اس تاریکی اور تیرگی کی صورت میں انسان دوستی اور محبت انسانی کا فانوس روشن کرنے کی تحریک دیتا ہے۔

پروفیسر نحوی اس مجلہ میں شامل مضامین کے انتخاب کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ مجوزہ مجلہ میں وہ مضامین جگہ پائے ہیں جو گزشتہ سال مضمون نویسی کے ایک مقابلہ کے لئے موصول

ہوئے تھے، جس کا موضوع ''اکیسویں صدی میں فکر اقبال کی معنویت'' تھا۔ چنانچہ مقابلے میں جو بہترین مضامین پائے گئے، ان کو اس مجموعہ میں شامل کیا گیا۔

پروفیسر نحوی پیش گفتار کے آخر میں ریاست اور بیرون ریاست کے اقبال شناسوں، عاشقان اقبال اور ہل علم سے ملتمس ہیں کہ وہ اپنی تخلیقات منظومات اور مضامین کو رسالہ اقبالیات میں چھپوائیں تا کہ زیادہ سے زیادہ عاشقان اقبال ان کی تخلیقات سے مستفید ہوں۔

۳) اقبالیات شمارہ نمبر ۱۷:

مجوزہ مجلہ فروری ۲۰۰۶ء میں پروفیسر نحوی کی ادارت میں اقبال انسٹی ٹیوٹ سے شائع ہوا۔ یہ مجلہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اول میں اقبال کے حوالے سے سرکردہ ادبا کے مقالات ہیں اور حصہ دوم حکیم منظور کے شاعرانہ فکر وفن پر پڑھے گئے مقالات پر مشتمل ہے۔

اداریہ میں پروفیسر نحوی مجلہ کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالتے ہیں اور اقبال کے نور بصیرت کو عام کرنا اور صالح قدروں کی آبیاری اس مجلہ کی پہچان بتاتے ہیں۔ پروفیسر موصوف ایسے اداروں کو سعادت مند سمجھتے ہیں جو اقبالیاتی ادب کی تشہیر میں لگے ہیں ایسے ادارے بھوپال، حیدرآباد، کیمبرج اور کشمیر میں قابل ذکر ہیں۔ اس مجلہ کا حصہ دوم کشمیر کے ایک مایہ ناز شاعر کی شخصیت وفن پر پڑھے گئے مقالات پر مشتمل ہے۔ پروفیسر نحوی ان کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''حکیم منظور کشمیر کے نمائندہ اردو شاعر ہیں، جن کے اشعار میں

ذہانت، متانت، قدرت بیان، اور ترکیب سازی کے جملہ محاسن
موجود ہیں اور کشمیر کی ہوا اور فضا اور اس وادیٔ گلپوش کے مظاہر و
منظر کی اعلیٰ شعری تصویر کشی موجود ہے۔'' ۱۰۷؎

مجلہ کے حصہ اول میں جن اصحاب قلم کے مضامین شامل ہیں' ان میں پروفیسر عبدالحق، پروفیسر علی احمد فاطمی، محمد بدیع الزماں، پروفیسر تسکینہ فاضل، ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی، ڈاکٹر محمد اعجاز اشرف، ایس اقبال قریشی اور پروفیسر بشیر احمد نحوی قابل ذکر ہیں۔

حصہ دوم ''گوشہ منظور'' پر مشتمل ہے۔ یہ وہ مقالات ہے' جو ۳۰ جولائی ۲۰۰۵ء کو ایک منعقدہ جلسہ میں پڑھے گئے تھے۔ اس میں جن اصحاب نے شرکت کی ان میں پروفیسر مرغوب بانہالی' پروفیسر قدوس جاوید، سید اسد اللہ آفاقی، اور پروفیسر بشیر احمد نحوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۴) اقبالیات شمارہ نمبر ۱۸:

یہ مجلہ پروفیسر بشیر احمد نحوی کی ادارت میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی حضرت بل سرینگر سے فروری ۲۰۰۷ء کو شائع ہوا۔ اس شمارے میں بارہ مضامین شامل ہیں۔ جہاں تک مضمون نگاروں کا تعلق ہے' ان میں پروفیسر عبدالحق، محمد بدیع زماں، پروفیسر قدوس جاوید، پروفیسر بشیر احمد نحوی، پروفیسر نظام الدین، پروفیسر تسکینہ فاضل، ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی قابل ذکر ہیں۔

حرف آغاز میں بشیر احمد نحوی کلام اقبال پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ اقبال کے

کلام میں مشرق ومغرب کا امتزاج ملتا ہے۔ ان کا کلام اور پیام اس کے قلب و ذہن کی حیران کن صلاحیتوں کی عکاسی کرتی ہے۔ انہوں نے اپنے کلام میں دور حاضر کے انسان کا اتنا جاندار تصور پیش کیا ہے جو زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ اپنی طاقت اور توانائی کا مظاہرہ کرتا رہے گا۔

۵) اقبالیات شمارہ نمبر ۱۹:

اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی کے زیر اہتمام شائع شدہ اقبالیات کا انیسواں شمارہ چودہ مضامین پر مشتمل ہیں۔ مذکورہ مجلہ کے مدیر ادارہ کے سابق ڈائریکٹر پروفیسر بشیر احمد نحوی ہیں۔ پروفیسر نحوی نے ابتدا میں تمہید کے طور پر گفتنی عنوان کے تحت عصر جدید میں علم وادب اور عقل و دانش کے پیش نظر اقبال کی معنویت اور ان کے دیئے ہوئے پیغام کو خاصی اہمیت کا حامل قرار دیا ہے۔ پروفیسر موصوف کے نزدیک مادی کشمکش کے حالات میں کلام اقبال ایک روحانی موجب کی حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں تک مجلہ میں شامل مضامین اور ان کے لکھنے والوں کا تعلق ہے' ان میں ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر علی احمد فاطمی، ڈاکٹر الطاف انجم کے علاوہ بقیہ تمام کا تعلق براہِ راست اقبالیاتی ادب سے ہے۔ ان میں بعض نے اقبال پر تحقیق کر کے مبسوط مقالے لکھے ہیں۔

اس مجلہ میں شامل بشیر احمد کا مضمون ''ایک دانش نورانی'' کے عنوان سے ہے۔۔ دانش نورانی کی ترکیب اقبال ہی کی ایک غزل کے مطلع سے ماخوذ ہے۔ مضمون میں اقبال کے حوالے سے دانش نورانی کی دو قسموں یعنی دانش نورانی اور دانش برہانی کے معنی بتا کر حدیث

کی رو سے مومن کی دانشمندی سے خائف ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔اس سلسلے میں صاحب مضمون نے اقبال کی فارسی تصنیف جاوید نامہ سے وہ مکالمہ بھی درج کیا ہے' جو اس بات کی تصدیق کرتا ہے۔ پروفیسر نحوی لکھتے ہیں :

> ''اقبال کے پورے کلام میں دانش نورانی کے مظاہر۔۔۔ کہیں۔۔۔صحابہ کبار کے جذبہ قربانی ،شجاعت،اولیا و مشائخ کے قصص و واقعات اور معرفت ذات کے نمائندوں کی سیرت پاک سے مزین ہے'' ۱۰۸؎

۶)حکیم مشرق:

پروفیسر نحوی کا مرتب کردہ انتخاب ۱۹۸۹ء میں اقبال اکیڈیمی سے شائع ہوا' یہ انتخاب ۷۴ صفحات پر مشتمل ہیں۔ اس میں دو حصے ہیں: ایک مضامین پر مشتمل اور دوسرا منظوم نذرانوں پر مشتمل ہے۔ اس انتخاب کے پیش لفظ میں بشیر احمد نحوی اقبال کی معنویت اور بلندی کے اسباب ومحرکات پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> ''اقبال نے زندگی اور کائنات کا واضح تصور پیش کیا، علامہ نے اپنی شاعری میں عصری تقاضوں اور ضرورتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے فطری نظریے سے آگاہ کیا، ان کا پیغام محدود نہیں تھا' وہ کسی خاص جماعت کے شاعر نہیں تھے بلکہ ان کا جذبہ ملی تھا''۱۰۹؎

علاوہ ازیں پروفیسر نحوی اقبال اکیڈیمی سرینگر پر بات کرتے ہوئے اسے اقبالیاتی ادب کی نشر و اشاعت کا ایک نیک شگون اور فعال ادارہ قرار دیتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ پروفیسر نحوی اکیڈیمی کا منشور بھی پیش کرتے ہیں کہ اقبال کے یوم ولادت ۹ نومبر اور یوم وصال ۲۱ اپریل کے مواقع پر ہر سال علمی و ادبی تقاریب منعقد کرنا، اقبال کی تصانیف کو اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں موثر حد تک شامل کرانے کا سعی کرنا اور مرا نور بصیرت عام کردے، کے جملہ تقاضوں کو پورا کرنے کی حتی الواسع جد و جہد کرنا۔

مجوزہ انتخاب (حکیم مشرق) میں چار مقالات ہیں' جو چوٹی کے اقبال شناسوں کے تحریر کردہ ہیں۔ان میں پروفیسر جگن ناتھ آزادؔ، ڈاکٹر حامدی کاشمیریؔ، پروفیسر شوریدہ کاشمیریؔ اور جناب مظہر امامؔ شامل ہیں۔منظوم نذرانوں میں مظہر امامؔ، میر غلام رسول نازکیؔ، مرزا جی ایچ بیگؔ، شبیب رضویؔ، پروفیسر شوریدہ کاشمیریؔ، قیصر قلندرؔ، پروفیسر جگن ناتھ آزادؔ، سلطان الحق شہیدیؔ، نشاط انصاریؔ، غلام نبی ناظرؔ، فاضل کاشمیریؔ وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

۷) بیادِ خواجہ امین بچھ:

یہ کتاب پروفیسر نحوی اور پروفیسر غلام رسول ملک کی مشترکہ نگرانی میں ترتیب پا کر اقبال اکیڈیمی کے اہتمام سے جون ۱۹۹۴ء میں شائع ہوئی۔اس کا انتساب خوش نوا شاعر مرحوم عبدالحق برق کے نام ہے۔اس انتخاب میں مرحوم خوجہ محمد امین بچھ کی ہمہ گیر شخصیت اور ان کے علمی و ادبی کارناموں کے حوالے سے تیرہ مضامین شامل ہیں۔اس کے علاوہ مرحوم کی چند متفرق تحریریں بھی شامل کی گئی ہیں۔

اس انتخاب میں شامل مضامین دراصل اکیڈیمی کے زیر اہتمام مرحوم محمد امین بوچھ کی یاد میں ایک ادبی و تعزیتی مجلس میں پڑھے گئے ان مضامین پر مشتمل ہیں' جو ان کی علمی و ادبی زندگی کے بعض اہم گوشوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ بالآخر ان مضامین کو کتابی شکل دی گئی' جسے پروفیسر موصوف اقبال اکیڈیمی کے لئے باعث سعادت قرار دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں پروفیسر نحوی نے اس بات پر زور دیا کہ مرحوم کی ان ۹ ڈائریوں پر تحقیقی کام کیا جائے تاکہ مرحوم کے شاندار ادبی اور علمی کارنامے اہل علم و دانش کے سامنے آئیں۔

۸) بیاد شوریدہ کاشمیری:

یہ کتاب ڈاکٹر غلام رسول ملک اور پروفیسر نحوی کی مشترکہ کوششوں سے ترتیب پاکر ۱۹۹۲ء میں جے کے آفسیٹ دہلی سے طبع ہو کر منظر عام پر آئی۔ اس کتاب کا پیش لفظ پروفیسر غلام رسول ملک کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں شوریدہ کی شاعرانہ زندگی' انکی خصوصیات اور دیگر پہلوؤں پر متفرق مضامین ملتے ہیں۔ اس کتاب میں ڈاکٹر بشیر احمد نحوی کا ایک مضمون ''حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا'' کے زیر عنوان ہے۔ اس میں پروفیسر نحوی اپنے استاد مکرم جناب شوریدہ کاشمیریؔ سے اپنے تعلقِ خاص کا تذکرہ کرتے ہیں۔

۹) وہ دانائے سبل ختم الرسلؐ:

اس کتاب کا تذکرہ سمینار والے حصہ میں آ گیا ہے۔

۱۰) نفحات اقبال:

یہ انتخاب اقبال انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر جناب پروفیسر بشیر احمد نحوی نے ترتیب دیا ہے ۔ جو مارچ ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا ہے۔ اس میں بارہ مضامین ہیں۔ آغاز میں پروفیسر نحوی نے انتخاب کی ترتیب کے مقصد پر روشنی ڈالی ہے۔ اس میں پروفیسر نحوی نے فکر اقبال سے متعلق کچھ ایسی باتیں شیدیان اقبال تک پہنچانے کی کوشش کی ہے جن سے ابھی تک وہ نا آشنا تھے۔

نفحات اقبال میں شامل مضامین اقبال کی حیات وشخصیت کے علاوہ ان کی شاعری اور فکر کے کئی اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس میں ان اقبال شناسوں کے مضامین شامل ہیں جنہیں اقبال سے ملاقات کا شرف حاصل رہا ہے۔ ان میں مشہور ومعروف اقبال شناس اور اقبال پر معرکتہ الآرا کتاب ''فکر اقبال'' کے مصنف ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے اپنے مضمون ''علامہ سے میری ملاقات'' میں اپنے ہم عصر اور مفکر شاعر علامہ سے اپنی ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا ہے۔

۱۱)اقبال کی تجلیات:

یہ مضامین کا مجموعہ پروفیسر بشیر احمد نحوی نے مرتب کیا ہے۔ اس کی اشاعت ۲۰۰۲ء میں ہوئی۔ یہ ایک سو اٹھاون ۱۵۸ صفحات پر مشتمل سات مضامین کا انتخاب ہے اس کا پیش لفظ پروفیسر نحوی کا تحریر کردہ ہے، جس میں وہ اقبال پر ہوئے کام کو سراہتے ہوئے اسے علم وادب اور فکر ونظر کی وسعتوں سے مزین قرار دیتے ہیں۔ اس انتخاب کے حوالے سے نحوی لکھتے ہیں:

''زیرنظر مجموعہ ''اقبال کی تجلیات'' چند ایسے منتخب مضامین پر مشتمل ہے، جو متعلمین اقبال کو نئی راہوں اور فکر ونظر کی نئی منزلوں کی طرف رہنمائی کر سکتے ہیں''۱۱۰؎

اس انتخاب میں چند عمدہ مضامین بھی شامل ہیں جیسے ''مطالعہ رومی کی تاریخ میں اقبال کا مقام''،''فلسفہ وجودیت اور اقبال''، ''اقبال ایک دانش نورانی''، ''حالی اور اقبال کے مقامات آہ وفغاں''۔''اقبال کی تجلیات'' کے عنوان سے اس انتخاب کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ اس میں بعض ایسے اقبال شناسوں کے مضامین بھی شامل ہیں، جنھوں نے اقبال پر قابل قدر تحقیقی کام کیا ہے۔

۱۲) تاریخ الانبیائؑ :

چار جلدوں پر مشتمل یہ کتاب منظوم کشمیری زبان میں لکھی ہوئی انبیائؑ کی تاریخ ہے۔ یہ تصنیف پروفیسر نحوی کے دادا کی لکھی ہوئی ہے، جسے پروفیسر موصوف نے دادا کے انتقال کے بعد تدوین وترتیب دے کر شائع کیا ہے۔اس کا سنہ اشاعت ۲۰۰۳ء ہے۔اس کتاب کی پہلی جلد خاصی اہمیت کی حامل ہے کیونکہ اس میں پروفیسر نحوی کے شجرہ حسب ونسب کے حوالے سے معلومات ملتی ہے۔اس کتاب کا انتساب انبیاءؑ کی پاکیزہ ارواح کے نام ہے جن کی تعلیمات نے بقول مرتب نواع انسانی کی فلاح وصلاح میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ابتدا میں مولف کتاب کا اجمالی جائزہ ملتا ہے۔اس کے بعد پیش لفظ میں تاریخ الانبیائؑ کے حوالے سے پروفیسر نحوی رقمطراز ہیں:

’’تاریخ الانبیاء میرے دادا حضرت مولانا مصطفیٰ مصفا کی چودہ سالہ عرق ریزی کا ثمرہ ہے آپ نے اپنے شباب کے دنوں میں دنیوی عیش و آرام کو خیر باد کہہ کے اپنی صبح و شام اس کتاب کی ترتیب، تدوین اور تنظیم پر صرف کر دئے۔ اس کتاب میں فقط ان پیغمبروں کے سوانح اور کارنامے درج کئے گئے ہیں جن کا ذکر قرآن پاک میں ہوا ہے اشعار کی تعداد تقریباً پنتیس ہزار ہے اس لئے کتاب کو کئی جلدوں میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔‘‘

۱۱۱ ؎

یہ منظوم نذرانہ کشمیری زبان میں شہکار کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کتاب کا اصل مسودہ ساٹھ ستر سال کی مروجہ رسا خط میں تحریر ہے لیکن بشیر احمد نحوی نے سے جدید کشمیری رسم الخط میں منتقل کر کے شائع کیا، جس میں ان کی محنت شاقہ کا خاصہ عمل دخل ہے۔

۱۳) اقبال بحر خیال:

زیر نظر کتاب کو پروفیسر نحوی نے مرتب دیا ہے۔ اس میں ہندو پاک میں علامہ اقبال کے تصورات وتخیلات پر نایاب، نادر، ورعمدہ ترین مقالات ومضامین شامل ہیں۔ یہ انتخاب فروری ۲۰۰۷ء میں اقبال انسٹی ٹیوٹ سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں ان مضامین کا انتخاب کیا گیا ہیں‘ جو یا تو بازار سے نایاب ہیں یا غالباً چند کتب خانوں کے ریفرینس سکشنوں تک محدود ہیں۔ یہ مضامین تحریری طور پر تکرار کے زمرے میں آتے ہیں لیکن ادب کے میدان

میں کسی عمدہ شعر، سنجیدہ مقولہ یا کسی بیش بہا اقتباس کو بار بار پڑھنا، چھاپنا، عام کرنا کوئی عیب نہیں۔ ان مضامین کو دوبارہ پڑھنے سے فکر کی نئی راہیں کھل سکتی ہیں اور سوچ کے زاویئے بدل سکتے ہیں۔

اس مجموعے میں جن ماہرین کے مضامین شامل ہیں' ان میں پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر محمد دین تاثیر، پروفیسر عبدالمغنی، پروفیسر محمد منور، ممنون حسن خان، شفیق اشرفی' پروفیسر بشیر احمد نحوی وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔

۱۴) اقبالیات۔۔گزشتہ دس سال:

اس کا تذکرہ سمینار والے حصے میں ہو چکا ہے۔

۱۵) فکر آزاد:

اس کا تذکرہ سمینار والے حصے میں آ چکا ہے ۔

۱۶) ارمغان نحوی:

یہ پروفیسر نحوی کی مرتب کردہ ایک اور کتاب ہے۔اس کا سنہ شاعت ۲۰۰۷ء ہے۔ اس کتاب کا انتساب انہوں نے کشمیر کے سرکردہ محقق، مورخ اور استاد جناب پروفیسر غلام محمد شاد کے نام کیا ہے۔ یہ کتاب ۴۴۴ صفحات پر مشتمل ہیں۔ درصل یہ کتاب پروفیسر نحوی کے والد خواجہ غلام حسن نحوی (مرحوم) کے مختصر نعتیہ کلام (کشمیری) مثنوی خطاب بہ کشمیر (فارسی) اور چند متفرق تاثراتی وفطری نظموں کے علاوہ خواجہ صاحب پر لکھے گئے مختلف

ادیبوں ، دانشوروں اور دینی رہنماؤں کے مقالات و تاثرات پر مشتمل ہے۔ پیش لفظ میں پروفیسر نحوی اپنے والد کی قلندرانہ شان کے حوالے سے لکھتے ہیں :

> ’’غلام حسن نحوی نے کبھی بھی اپنے کلام کو سستی شہرت اور مصنوعی مقبولیت کا روا دار نہیں رکھا۔ وہ ہمیشہ اس طرف بے اعتنائی برتتے رہے‘ ورنہ ان کی ساری زندگی شعر و ادب کی فکر میں گزری۔ انہوں نے کبھی بھی اپنے منظوم و منثور کلام کو جمع رکھنے کا اہتمام نہ کیا۔‘‘ ۱۲۱

غلام حسن نحوی قلندرانہ شان وشوکت کے مالک ،ایک سچے دل اور دین دار انسان تھے۔ وہ کبھی بھی دنیوی شہرت سے خوش نہ ہوئے ۔انہوں نے یہ گوارہ نہیں کیا کہ چند سستے داموں ، یا مصنوعی شہرت کے عوض اپنے کلام کو بیچ ڈالیں‘ اسی لئے انہوں نے کبھی بھی اپنے کلام کو جمع کرنے کا کوئی ارادہ نہیں کیا۔انہوں نے اس میں سنجیدگی سے کام نہیں لیا اور رنہ ہی کوئی نقل اپنے پاس ظ کرنے کی کوشش کی ۔

یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔حصہ اول میں مرحوم غلام حسن نحوی کے دستیاب شدہ نعتیہ کلام (کشمیری) اور ایک مثنوی خطاب بہ کشمیر (فارسی) کا انتخاب ہے ۔خواجہ غلام حسن نحوی سچے دین دار انسان تھے انہیں اپنے دینی تعلیمات سے گہری وابستگی تھی ، وہ ہمیشہ فکر مند رہتے تھے ۔ وعظ و تبلیغ کی رویت ان کو ورثہ میں مل تھی ۔ انہوں نے اپنے نعتیہ کلام میں اپنی والہانہ عقیدت اور وابستگی کا اظہار کیا ہے۔ان کے نعتیہ کلام میں ایمانی اور ایقانی جذبہ موجود

ہے۔اسی طرح کشمیر کے موضوع پر ان کی مثنوی اپنی مثال آپ ہے۔ پروفیسر شاد اس مثنوی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''نحوی صاحب کی یہ مثنوی مختصر ہونے کے باوجود کشمیر کے فارسی شعر وادب میں ایک قابل قدر تخلیق ہے، سبک ہندی میں گزشتہ ایک صدی سے اس پایہ کی کوئی فارسی مثنوی راقم کی نظر سے نہیں گزری ہے۔'' ۱۱۳ے

حصہ دوم میں مرحوم غلام حسن نحوی پر لکھے گئے مختلف اصحاب قلم کے مقالات ہیں۔ان مقالہ نگاروں میں پروفیسر عبدالحق، پروفیسر مرغوب بانہالی، پروفیسر غلام محمد شاد، مولانا محمد سید اشرف اندرابی، سید رسول پوپنر، پروفیسر حمید رفیع آبادی، ڈاکٹر شاد رمضان، سید محمد فضل اللہ، پروفیسر عبدالغنی، ڈاکٹر مجید اندرابی، ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی، مظفر احمد زرگر، ماسٹر رفیع الدین بودا، بشیر احمد بشیر، پروفیسر نحوی، مولانا غلام رسول امام، پروفیسر عبداللہ شیدا شامل ہیں۔

حصہ سوم گوشہ پیغامات پر مبنی ہے۔اس میں منظوم اور نثری دونوں طرح کے پیغامات ہیں۔اس میں پروفیسر غلام محمد شاد کا لکھا ہوا منظوم نذرانہ عقیدت بھی شامل ہے۔علاوہ ازیں اس میں جن ادباء کے تعزیتی پیغام شامل ہیں' ان میں پروفیسر حامدی کاشمیری، مفتی بشیر احمد، عبدالرحمان مخلص، مفتی ضیاء الحق ناظمی، سلام الدین شاہ، حکیم منظور مرحوم، حاجی محمد عبداللہ قادری اور مسٹر بشیر احمد بشیر اگلرو شامل ہیں۔

:Iqbal,s Multiformity

انگریزی میں تحریر کئے گئے مشرق ومغرب سے تعلق رکھنے والے ماہرین اقبالیات اور ارباب فکر ونظر کے تیرہ مضامین پر مشتمل یہ انتخاب ہے، جس میں بیشتر مضامین کو مرتب نے پاکستان سے شائع ہونے والے رسالہ ''اقبال ریویو'' سے ماخوذ بتایا ہے۔ ان میں علامہ کی شاعری اور فکر کے مختلف اور اہم پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے۔ اس انتخاب میں فلسفہ کے ممتاز پروفیسر ایم۔ ایم شریف کے دو مضامین اقبال کا نظریہ حسن اور اقبال کا نظریہ فن کے عنوانات کے تحت شامل ہیں۔ ایک مضمون اطالوی مستشرق پروفیسر اہلیہ ساندرو بوزانی کا ہے۔

:Iqbal,s ideas of self

اس کتاب کی اشاعت فروری ۲۰۰۲ء میں ہوچکی ہے۔ فاضل مرتب نے دیباچہ میں مقالہ اور مقالہ نگار کی نسبت یہ سطور تحریر فرمائی ہیںThe booklet entitled Iqbal,s Ideas of Self written by Mohd Rafiudin Hashmi who is a noted Iqbal scholar of the subcontinent.

Religio-philosophical Ideas

یہ کتاب ۲۰۰۳ء میں شائع ہوچکی ہے۔ اس کتاب میں ماہرین اقبال کے انگریزی میں تحریر کئے گئے بارہ مضامین شامل ہیں۔ فاضل مرتب دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں:Allama

muslim Iqbal is uniqe among the contemporary thinkers in utilizing theology ,philosophy,mysticism and

potent emotional appeal and the sweet sytle of psuedo-Urdu poetry to understand and explain the destiny of the man and then to relate that vision to his social life and polity.it is Iqbal,s capability to tranverse the axpanse,which separates philosophy from socio-cultural concern that has made him a philosopher and cultural and social hero.

بحیثیت مجموعی ان تمام تالیفات میں مرتب کی محنت شاقہ کا خاصا عمل دخل ہے۔اقبال پر تحریر کے گئے مقالات کے وافر ذخیرے میں سے چند مضامین کا انتخاب کرنا نیز ان کی ترتیب، انہیں خوبصورتی سے کمپوز کرانا، ان کے پروف صحیح کرنا اور پھر ان کی طباعت وغیرہ ان تمام مراحل سے مرتب کا گزارنا نہ صرف اقبالیات کے تئیں ان کے غیر معمولی شغف بلکہ اقبال کے نوربصیرت کو عام کرنے کی بھی بڑی حد تک ضمانت فراہم کرتا ہے۔

متفرق مضامین:

پروفیسر بشیر احمد نحوی بسیار گو ہیں۔شعروادب کی فکر کرنا ان کی روزمرہ زندگی کا مشغلہ ہے۔ وہ آئے دن کسی نہ کسی موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ ان کے مضامین اکثر و بیشتر ریاست کے مختلف اخبارات میں چھپتے رہتے ہیں۔گزشتہ کئی برسوں سے پروفیسر نحوی ریاست کے کثیر الاشاعت اخبار''روزنامہ کشمیر عظمیٰ'' کے لئے اپنے مضامین رقم

کر رہے ہیں۔اس اخبار میں ان کا کالم''سرحد ادراک'' کے نام سے ہے۔ان کی تحریروں کوعوام وخواص نے ہمیشہ بہ نظر استحسان دیکھا اور پڑھا ہے۔آیئے اب ان کے متفرق مضامین کا جائزہ لیتے ہیں۔

مولانا غلام نبی مبارکی۔۔۔اشکبار نعت خواں' واعظ خوش بیاں:

یہ مضمون روزنامہ کشمیر عظمیٰ میں ۳ جولائی ۲۰۱۳ءکو شائع ہوا۔اس میں پروفیسر نحوی نے مولانا غلام نبی مبارکی کی وعظ خوانی اور تبلیغ دین کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔مضمون نگار ان کی وعظ خوانی،شعلہ بیانی،علم ودانش،انداز گفتگو طرز عمل سے بے حد متاثر بھی ہے اور عقیدت مند بھی ہے۔چنانچہ لکھتے ہیں کہ مجھے پوری وادی میں مولانا مبارکی جیسا واعظ آج کہیں نظر نہیں آتا ہے۔

لولاکؐ۔۔۔چندر بھان خیال کے فکری آفاق:

یہ مضمون ۴ ستمبر ۲۰۱۳ءکو روزنامہ کشمیر عظمیٰ میں شائع ہوا۔اس مضمون میں مضمون نگار نے چندر بھان خیالؔ کی شہرہ آفاق تصنیف (لولاک) پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے چندر بھان خیالؔ کی جولانی فکر کا شہکار تعبیر کیا ہے۔خیالؔ کی مذہبی رواداری، عالی حوصلگی اور احترام مذہب کے حوالے سے مضمون نگار نے خوشی کا اظہار کیا ہے۔چندر بھان خیالؔ نے نبی برحقؐ کی بعثت ورسالت اور ولادت باسعادت کے جملہ مقاصد کو نظم کے قالب میں ڈھال کر عقیدت وعظمت نبوت کے مختلف گوشوں کو سامنے لایا ہے۔پروفیسر نحوی لکھتے ہیں کہ اس سے

پہلے اس نوع کی مثالیں حالی کی مسدس اور حفیظؔ کے شاہنامہ اسلام میں موجود ہیں۔ ان میں اسلام اور ملت اسلامیہ کے عروج وزوال کی داستان ہے۔ اس کے برعکس خیالؔ نے عروج وزوال کے بجائے تعلیمات نبوی کی افادیت اور عصر حاضر میں ان کی معنویت کو سلاست زبان کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اپنے مضمون کے آخر میں پروفیسر نحوی خیالؔ کو مبارکباد پیش کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اس کتاب پر تین سرکردہ ادباء کی آراء کو نقل کرتے ہیں جن میں شمس الرحمان فاروقی، ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر صادق شامل ہیں۔

حامدیؔ اردو دنیا کی قدآور ہستی:

یہ مضمون ۱۸ ستمبر ۲۰۱۳ء کو روزنامہ کشمیر عظمیٰ میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں ریاست کے معروف ومشہور شاعر، ادیب، ناقد پروفیسر حامدی کاشمیری کی خدمات پر تبصرہ کرتے ہوئے انہیں ایک عظیم فرزند کشمیر سے تعبیر کیا ہے۔ مضمون نگار لکھتے ہیں کہ حامدی کاشمیری ریاستی اور ملکی سطح پر اپنا لوہا منوا چکے ہیں۔ حامدی نے ادب کے ہر میدان جیسے تنقید، شاعری، افسانہ، غالبیات، اقبالیات کے علاوہ کشمیری ادبیات میں اپنے اشہب قلم کے زور سے سکہ بٹھا لیا ہے۔ وہ اردو کے منکسر المزاج اور شگفتہ دل استاد و نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ ہر ایک کی خیرخواہی و خیر طلبی میں لذت محسوس کرتے ہیں۔ اپنی نثر نویسی میں جس قدر ثقیل الفاظ ومصطلحات کا بکثرت استعمال کر کے نقد ونظر کو نئے معانی ومفاہم فراہم کرتے ہیں' اسی قدر نرم دم گفتگو ہو کر دوسروں کا دل موہ لیتے ہیں۔

محمد علی جوہر۔۔۔انسانی پیکر میں شعلہ جوالہ:

یہ مضمون ۱۱۲ اکتوبر ۲۰۱۳ء کو روزنامہ کشمیر عظمیٰ میں شائع ہو۔ پروفیسر نحوی محمد علی جوہر کی سیمابی طبیعت پر گفتگو کرتے ہوئے انہیں جذبہ ملی، حمیت قوم اور شوق سرفروشی سے سرشار رہنما قرار دیتے ہیں۔ ان کی انگریزی زبان پر دسترس کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مولانا محمد علی جوہر عصری بیداری اور جدید علوم وفنون میں مسلمانوں کو بہت آگے جانے کا مشورہ دیتے تھے۔ ان کے نزدیک قدامت پرستی، تنگ نظری اور تعصب ملت اسلامیہ کے لئے سمِ قاتل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

پروفیسر نحوی اپنے مضمون میں جہاں مولانا کو شعلہ بیان مقرر (اردو، انگریزی) صحافی، بے باک سیاسی قائد اور ان کی شاعری کو وطن، عشق و مذہب کے جذبوں، آرزوں سے سرشار قرار دیتے ہیں وہیں انہیں ان کی شاعری میں فنی اور لسانی فقدان نظر آتا ہے۔

اردو ادب میں تانیثیت۔۔ڈاکٹر مشتاق کا منفرد ادبی کارنامہ:

پروفیسر نحوی کا یہ مضمون ۱۲۳ اکتوبر ۲۰۱۳ء کو شائع ہوا۔ دراصل یہ مضمون ڈاکٹر مشتاق احمد وانی مصنف ''اردو ناول میں تہذیبی بحران'' کی دوسری کتاب ''اردو ادب میں تانیثیت'' پر تبصرہ ہے۔ مضمون نگار ڈاکٹر وانی کے اس تحقیقی کارنامے کو سراہتے ہوئے انہیں علم وادب کے ایسے شیدائی و شناسا قرار دیتے ہیں' جو بہ الفاظ آل احمد سرور کار بار شوق کے جذبے کے تحت کام کرتے ہیں۔ اس کتاب میں مضمون نگار چند نقائص کی نشاندہی بھی کرتے

ہیں۔ یہ کتاب اردو قارئین خصوصاً تانیثی ادب کے شیدائیوں کے لئے بڑی فیض بخش ہے۔ پروفیسر نحوی کے الفاظ ہیں: ''اسلام آزاد کی کتاب سے لے کر امرتا پاسو کی تصنیف تک ایک سو چھیانوے اردو اور انگریزی کتابوں سے جو فیضان ڈاکٹر وانی نے حاصل کیا ہے' اس سے یقیناً اردو ادب کے قارئین اور بالخصوص تانیثیت کے عنوان سے شیفتگی رکھنے والے بہرہ مند ہوں گے۔ ڈاکٹر مشتاق نے جانفشانی اور عرق ریزی سے کام لے کر اردو ادب کے دامن کو ایک منفرد ادبی شہکار سے مزین کیا ہے۔

غالب شناسی بحوالہ کلام غالب:

زیر نظر مضمون ۱۳۰ اکتوبر ۲۰۱۳ء کو روزنامہ کشمیر عظمیٰ میں شائع ہوا۔ یہ مضمون برصغیر ہندو پاک کے ممتاز شاعر مرزا اسداللہ خان غالبؔ کے فارسی کلام پر ایک تاثراتی نوعیت کی تحریر ہے۔ پروفیسر نحوی ان کے فارسی کلام کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ غالبؔ کے فاسی کلام میں جس غزل کو دیکھئے، اس میں ان کی بلند پروازی، نازک خیالی، اور مضمون آفرینی کے مظاہر سامنے آتے ہیں۔ وہ اپنے طائر کو نہایت ہی بلندیوں تک لے جا کر واپس ارضی حالات میں لوٹا دیتے ہیں۔

مضمون نگار اپنے مضمون میں برصغیر میں غالبؔ پر ہوئے کام کو سراہتے ہوئے اسے گنجینہ معانی کے طلسم راز کے تیئں نیک شگون قرار دیتے ہیں، کیونکہ اس بلند مرتبہ شخص کی شاعری ہر نئے عہد میں اپنی اثر پذیری سے شاعروں اور شاعری کے شیدائیوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی رہے گی اور ان کے کلام میں موجود نوائے سروش انہیں بقائے دوام بخشتی رہے

گی۔

شہباز راجوروی۔۔۔خطۂ پیر پنچال کی سخنوری:

یہ مضمون ۶ نومبر ۲۰۱۳ء کو پروفیسر موصوف کے کالم سرحد ادراک کی زینت بنا۔ مذکورہ مضمون میں مصنف نے خطۂ پیر پنچال کے شاعر شہباز راجوروی کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کی شاعری کو فطرت کے داخلی حسن وزیبائش سے مملو قرار دیا ہے۔ پروفیسر موصوف کا کہنا ہے کہ شہباز کی شاعری صفحہ اول کے شعراء کی شاعری کی طرح ہر وہ فن و ہنر رکھتی ہے، جو ہر دور میں ہر دل عزیز شاعری کا تقاضا رہا ہے۔ پروفیسر نحوی مضمون کے آغاز میں شہباز راجوروی کو مرد کوہسار کے لقب سے تعبیر کرتے ہیں اور اپنے دعوے کی دلیل میں حسب ذیل اشعار پیش کرتے ہیں۔ ؎

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندہ صحرائی یا مرد کوہستانی
یہ حسن و لطافت کیوں شہباز بیانی
بلبل چمنستانی شہباز بیانی
اے شیخ بہت اچھی مکتب کی فضا لیکن
بنتی ہے بیاباں میں فاروقی و سلیمانی

پروفیسر نحوی مزید لکھتے ہیں کہ شہباز راجوروی اپنے دور کی ابتری پر نوحہ کناں ہیں۔ وہ اپنے معاشرے میں آئے دن افراتفری، بربریت، ظلم وتشدد، بدنظمی سے بے حد مایوس ہیں

اوراس کا بھر پور اظہار ان کے کلام میں بخوبی ملتا ہے۔شہباز راجوروی عصر حاضر کے کرب کو شدت سے محسوس کرتے ہیں۔جس سے ہمارا یہ خطہ دو چار ہے۔ ے

اپنے شبستان محبت میں نہیں سودائے دل

بے مروت موسموں سے کیا کہیں گفتائے دل

بے زبان، محتاج مظلوموں پہ نازل آفتیں

ترجمانی کا کسے یارا ہے اے صحرائے دل

یوں تو شہباز راجوری سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ان کے کلام سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ انہیں وادیٔ کشمیر کے ذرے ذرے سے بے پناہ پیار ہے اور یہاں کے منظروں سے انھیں قلبی وابستگی ہے۔ پروفیسر نحوی لکھتے ہیں کہ جہاں شہباز کی شاعری ایک سنجیدہ فکر کے جذبات اور تجربات کی آئینہ دار ہے، وہیں بعض مقامات پر فنی کمی اور تسامحات بھی دیکھنے کو ملتے ہیں اس طرح اس مضمون میں نہ صرف شہباز راجوروی کی شاعرانہ خصوصیات سامنے آتی ہیں بلکہ مضمون نگار کی ناقدانہ بصیرت کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس بے باک انداز سے اپنی رائے دیتے ہیں۔

آدم گرِ ہمدان کو سلام :

یہ مضمون ۱۹ اکتوبر ۲۰۱۳ء کو روزنامہ کشمیر عظمیٰ میں شائع ہوا۔اس مضمون میں مضمون نگار نے شاہ ہمدان امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ کی ذات کو کشمیریوں کے لئے باعث فخر قرار دیا ہے۔امیر کبیرؒ ایران ہمدان سے سات سو سادات لے کر وارد کشمیر ہوئے اور یہاں اسلامی

تعلیمات کا پرچار شروع کیا۔ اس سے پہلے کشمیر کے لوگ مشرکانہ عقائد کے ماحول میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ انہوں نے کشمیر میں اسلامی تعلیمات کا بڑے پیمانے پر پرچار شروع کیا اور کشمیری مسلمانوں پر بے حد احسانات کئے' انہوں نے کشمیری مسلمانوں کو وظیفہ کے طور پر ذخیرۃ الملوک اور اوراد فتحیہ کا انمول تحفہ دیا۔ مضمون نگار نے مزید لکھا ہے کہ علامہ نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف میں کشمیر کی جن دو بلند مرتبہ شخصیات سے روحانی ملاقات کا تذکرہ کیا ہے وہ امیر کبیرؒ اور ملا غنی کشمیریؒ ہیں۔ علامہ نے اپنی تصنیف میں امیر کبیر سے روحانی ملاقات کا تذکرہ کیا ہے' جس میں علامہ حضرت امیر کبیر سے باضابطہ طور پر سوالات کرتے ہیں اور امیر کبیرؒ بڑے ہی فاضلانہ انداز میں انہیں جواب دیتے ہیں۔ پروفیسر نحوی مزید کہتے ہیں کہ کرہ ارض پر کشمیر جب تک موجود ظ ہے' جناب شاہ ہمدان کا قرض ہر کشمیری مسلمان کی گردن پر رہے گا اور یہ قرض اسی صورت میں مسلمانان کشمیر ادا کر سکتے ہیں کہ ان کے عظیم علمی، تبلیغی، اصلاحی اور ثقافتی کارناموں سے اپنی نئی پود کو باخبر رکھیں۔ ان کے نام نامی پر مباحثوں اور سمیناروں کا اہتمام کریں اور ایک ایسی اکیڈیمی قائم کریں جہاں ہر سال اس محسن کشمیر کے احسانات کا ذکر جمیل ہو۔

اقبال۔۔۔سرزمین عرب کا تصوراتی سفرنامہ:

زیر نظر مضمون کشمیر عظمیٰ میں ۹ نومبر ۲۰۱۳ء کو شائع ہوا۔ مضمون نگار اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ جہاں بے شمار فارسی شعراء نے نبی برحقؐ کے تئیں اپنے گل ہائے عقیدت پیش کئے ہیں' وہاں اقبال اس صف میں سب سے آگے نظر آتے ہیں۔ علامہ نے عمر بھر سرزمین

حجاز کی فضاؤں میں اپنے فکر کے پروانے اُڑائے ہیں اور اپنے تخیل کا سارا زور اور فکر کی رسائی رسالت مآبؐ کی سرزمین کے سفر میں بروئے کار لائی ہے۔نحوی کے الفاظ ہیں کہ ''ارمغان حجاز'' ذات نبویؐ کے ساتھ اقبال کی بے پناہ وابستگی اور والہانہ شیفتگی کا ایک تخیلاتی سفرنامہ ہے۔

اس سفر میں علامہ اولاً حضورؐ کے دربار میں حاضر ہوکر اپنے تاثرات ومشاہدات اور ملت اسلایہ کی بے عملی، بے یقینی اور کورذوقی پر اظہار افسوس کرتے ہیں۔اس سفرنامہ میں علامہ خدا کے حضور درخواستیں اور دعائیں کرتا ہے کہ مسلمانوں میں اتفاق اور یکجہتی کے جذبے کو سرشار کرے اور انہیں ہدایت فرمائے تاکہ روزحساب کے دن ہماری وجہ سے ختم الانبیاؐ کو شرمسار نہ ہونا پڑے۔

۲۰۱۴ئ۔۔۔کشمیر گردش شام وسحر کے درمیان:

یہ مضمون ۳۱ دسمبر ۲۰۱۴ءکوسرینگر سے شائع ہونے والے روزنامہ کشمیر عظمیٰ میں شائع ہوا۔اس مضمون میں پروفیسر موصوف نے ریاست کے بدلتے ہوئے سیاسی اور سماجی حالات پر گفتگو کی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ریاست میں ستمبر ۲۰۱۴ء کے سیلاب سے پیدا شدہ حالات پر اظہار افسوس کیا ہے۔

مادری زبان سے دوری۔۔۔۔احساس کمتری:

یہ مضمون ۲۴ دسمبر ۲۰۱۴ءکو شائع ہوا۔مضمون نگار اس میں اپنی مادری زبان سے

بے اعتنائی برتنے کو احساس کمتری سے تعبیر کرتے ہیں۔ پروفیسر موصوف اپنے مضمون لکھتے ہیں کہ کشمیریوں کی مادری زبان کی حالت خستہ کی مثال، ہندستان میں اردو زبان کی خستہ حالی سے مشابہت رکھتی ہے۔ کشمیر میں کشمیری زبان کی حالت اسی طرح زوال پذیر ہے جیسے ہندستان میں اردو زبان ہے۔ وہ اس تشویش کا اظہار کرتے ہیں کہ ریاست میں اپنی مادری زبان کی طرف اگر مناسب اقدام نہ اٹھائے گئے تو بہت جلد ایک قوم ایسی ہوگی جس کی پہچان ختم ہوگی۔

اپنے مضمون میں مقالہ نگار نے ایک خوش آئند بات یہ کہی ہے، کہ بے روح اور احساس کمتری میں گرفتار قوموں میں ایسے باضمیر اور باصلاحیت لوگ بھی ہوتے ہیں جو اپنی تہذیب، اخلاقی اقدار اور تمدنی میراث کے تحفظ کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ اس ضمن میں مقالہ نگار کشمیری ادیبوں اور دانشوروں کے ساتھ ساتھ بعض ادبی اداروں کی کوششوں کو مستحسن قرار دیتے ہیں۔

شعراءعرب وعجم بارگاہ سرور دو عالمؐ میں:

یہ مضمون ۷ جنوری ۲۰۱۵ء کو روزنامہ کشمیر عظمیٰ میں نحوی صاحب کے متواتر طور پر شائع ہونے والے کالم ''سرحد ادراک'' میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں کالم نگار نے ادارہ فروغ اردو لاہور کے مجلہ ''نقوش'' کے رسولؐ نمبر پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ پروفیسر موصوف نے اس مجلہ کے خصوصی ''رسول ﷺ نمبر'' کو سرورِ دو عالم کی بارگاہ میں عرب وعجم کے شعراء کی طرف سے اپنے جذبہ محبت اور گلہائے عقیدت سے تعبیر کیا ہے۔ پروفیسر نحوی نے اس

مضمون میں کہا ہے کہ ''نقوش'' رسولؐ نمبر کے اس اہم نعتیہ کلام پر مبنی شمارے میں عرب وعجم کے چند اہم نعت گو شعراء کے گل ہائے عقیدت کو مرتب نے بڑی عرق ریزی کے ساتھ ساڑھے سات سو صفحات پر پھیلا کر صنفِ نعت سے شغف رکھنے والوں کے لئے ایک معطر چمنستان سجایا ہے۔ اس مجلہ میں شامل نعت گو حضرات نے حیاتِ طیبہ کے حالات وواقعات اورغزوات فنِ شعر میں استعاراتی اور تلمیحاتی اسلوب میں بیان کئے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ آپؐ کی تعلیمات، ارشادات، انسانی دنیا پر آپؐ کے احسانات کو شعر کے قالب میں پیش کیا ہے۔ اس مجلہ کے خصوصی نمبر کی اہمیت وافادیت پر نگاہ ڈالنے کے باوجود مضمون نگار نے چند ایک کوتاہیوں کی نشاندہی کی ہے۔

شاہراہ کشمیر۔۔۔تعمیر کے رخسار پر بدنما داغ:

یہ مضمون ۲۵ مارچ کو روزنامہ کشمیر عظمیٰ میں شائع ہوا۔ اس میں پروفیسر موصوف نے جہاں ترقی یافتہ ممالک کی معاشی، تعلیمی، تجارتی اور کاروباری ترقی میں شاہراہوں کے کلیدی کردار کو واضح کیا ہے وہیں اپنی ریاست میں مدتوں سے پڑی خستہ حال سڑکوں کی طرف حکومت کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ انہوں نے ایسے بیشتر مقامات کا ذکر کیا ہے، جہاں سڑکوں کی خستہ حالی اور ٹریفک جام کی وجہ سے مسافروں کو بڑی کوفت ہوتی ہے۔ پروفیسر موصوف حکومت کے ایوانوں تک یہ بات پہنچانا چاہتے ہیں کہ ہنگامی صورتحال میں ان سڑکوں کو ٹھیک کرایا جائے۔

جنوب وشمال......زمستان ہوؤں کے احوال:

یہ مضمون ۱۴ جنوری ۲۰۱۵ء کو روزنامہ کشمیر عظمیٰ میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں پروفیسر نحوی نے کشمیر میں سیلاب کے بعد سرما کی شدید سردی سے پیدا شدہ حالات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس سردی سے بچنے کے لئے جہاں صاحب ثروت لوگ ملک کے دوسرے گرم شہروں میں جاتے ہیں، وہیں متوسط اور غریب لوگ اس شدید سردی کا مقابلہ کر کے اپنے کاروبار کو چلائے رکھتے ہیں۔ پروفیسر نحوی لکھتے ہیں کہ یہاں سرما آبادی کے ایک کثیر حصے کو مفلوج کر کے چھوڑ دیتا ہے، چنانچہ یہاں اس موسمی خرابی سے نمٹنے کے لئے ایسے وسائل ہی دستیاب نہیں ہیں، جب کہ دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی ایسی سردی پڑتی ہے اور بعض شہروں میں اس سے بھی زیادہ خطرناک جاڑے کا موسم ہوتا ہے مگر وہاں کے لوگ بہ احسن اس سے گزرتے ہیں اور کاربار زندگی کو آرام کے ساتھ چلائے رکھتے ہیں۔

پرندوں کی دنیا:

۲۱ جنوری ۲۰۱۵ء کو کشمیر عظمیٰ میں شائع ہونے والا مضمون پروفیسر نحوی کے جمالیاتی اور کارخانہ قدرت کو حسین وجمیل بنانے والے نباتات، جمادات، حیوانات اور پنچھیوں سے ان کی دلچسپی اور معلومات کو ظاہر کرتا ہے۔ نحوی صاحب جہاں احترام آدمیت کے قائل ہیں وہیں یہاں وہ پرندوں کی دنیا کا درویش نظر آتے ہے، لکھتے ہیں کہ کائنات کے بنانے والے نے لاتعداد مخلوقات کو جنم دیا ہے، جن کی اداؤں، صداؤں اور بود و باش کی عادتوں کو دیکھ کر

آدمی ورطہ حیرت میں پڑتا ہے اور اس نکتے پر غور وفکر کرتا ہے کہ نظام قدرت نے مختلف عناصر کتنی شاندار ترتیب و تنظیم کے ساتھ ایک دوسرے ساتھ جوڑ دئے ہیں۔اس فضائے بسیط میں اڑنے والے اور پانی پر تیرنے والے پرندوں کو صناع کائنات کی صنعت گری کے مظاہر سے تعبیر کرتے ہوئے نحوی سعدی شیرازیؒ کا حسب ذیل شعر بطور حوالہ پیش کرتے ہیں۔

ے

برگ درختان سزدر نظر ہوشیار

ہر ورقے دفتر بست و معرفت کرد گار

پروفیسر نحوی جہاں کشمیر پائے جانے والے بے شمار رنگا رنگ پرندوں کی موجودگی سے خوشی محسوس کرتے ہیں، وہیں ریاست میں آبی پناگاہوں میں پرندوں کی گھٹتی ہوئی تعداد اور پرندوں کی نقل مکانی پر افسوس ظاہر کرتے ہیں۔نحوی پرندوں کے ساتھ حسن سلوک کی بات کرتے ہوئے ان سے محبت کرنا، ان کی نگہداشت کرنا، انہیں دانا کھلانا ہر کام کو مستحسن عمل گردانتے ہیں۔

عربی وفارسی ادب......نذر طاق نسیاں!:

زیر نظر مضمون ۲۸ جنوری ۲۰۱۵ء کو روزنامہ کشمیر عظمیٰ میں شائع ہوا ہے۔اس مضمون میں نحوی نے عربی وفارسی ادب سے گھٹتی ہوئی دلچسپی کے پیش نظر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔نحوی لکھتے ہیں کہ اقبال نے قیام یورپ میں جو غائر مطالعہ کیا' اس سے علامہ پر اس بات کا انکشاف ہوا کہ یورپ کی ترقی اور علم وفلسفہ کے سارے سرچشمے ہمارے وراثتی ادب یعنی

عربی و فارسی سے فیضیاب ہیں جب کہ دوسری طرف ہم نے اپنے وراثتی ادب سے منہ موڑ دیا ہے۔ اسی صورتحال کے پیش نظر نحوی لکھتے ہیں کہ جہاں دنیا بھر میں عربی و فارسی ادب کے قارئین کی قحط سالی نظر آتی ہے وہیں ہماری ریاست میں بھی عربی و فارسی ادب نذر طاق نسیاں ہوگیا۔ نحوی مزید لکھتے ہیں کہ ترقی کے نام پر جس ادب کو لوگوں نے تھام لیا ہے وہ غالباً زرکم عیار ہیں اور ایک وقت ایسا آئے گا جب ان لوگوں کی فکری اور روحانی پیاس بجھانے کے لئے یہی بھلائے ہوئے ادب کے شہہ پارے کام آئیں گے۔

غنی کشمیریؔ...... بے بدل فارسی سخنور:

یہ مضمون ۱۸ فروری ۲۰۱۵ء کو کشمیر عظمیٰ میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں بشیر احمد نحوی نے کشمیر کے ایک نابغہ روزگار فارسی شاعر ملا طاہر غنی کاشمیریؔ کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کی فنکارانہ بصیرت اور بلند پروازی سے غالبؔ اور اقبالؔ جیسے بلند قامت شعراء نے خوب خوب استفادہ کیا ہے۔ اقبالؔ اپنی مایہ ناز تخلیق میں غنی کشمیریؔ کو یوں بیان کرتے ہیں۔ ؎

شاعر رنگیں نوا طاہر غنی
فقر او ظاہر غنی باطن غنی

بشیر احمد نحوی اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ غنی کشمیریؔ کی فنکارانہ بصیرت کو ایران میں کافی بلند نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ جب کہ ریاست (کشمیر) جہاں کا یہ فرزند ہے، کے باشندے اب اس کے نام تک سے بے خبر سے ہو گئے ہیں۔ اس سپوت کشمیر کے کلام کی ورق

گردانی سے ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ چارسو سال پہلے انہوں نے یہاں کے لوگوں کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کی ہیں۔مضمون نگار لکھتے ہیں کہ ان پر بعض لوگوں نے تحقیقی کام کیا ہے جن میں ڈاکٹر ریاض احمد شروانی، احمد کرمی (انہوں نے دیوان غنی کشمیری مرتب کیا ہے) ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی قابل ذکر ہیں۔ابھی اس سپوت کشمیر کے کلام اور زندگی کے حوالے سے بہت سارا کام کرنے کی گنجائش ہے۔

مولانا عامر عثمانی......نظم ونثر میں گہرفشانی:

زیر نظر مضمون ۲۵ فروری ۲۰۱۵ء کو روزنامہ کشمیر عظمیٰ میں شائع ہوا۔س میں نحوی رقم کرتے ہیں کہ سن طفل میں مجھے جن بلند پایہ نثار اور نظم گو شخصیات کے رشحات دیکھنے کے مواقع فراہم ہوئے ان میں ماہر القادری کا ''فاران'' شورش کاشمیری کا ''چٹان'' دارالمصنفین کا ''معارف'' اور مولانا عامر عثمانی کا ''تجلی'' قابل دید ہے۔مولانا عامر عثمانی دارالعلوم دیوبند (جو برصغیر کی نمائندہ دینی تعلیم گاہ ہے) سے فارغ التحصیل تھے۔انہوں نے مختلف دینی رسائل وجرائد ملک کے مختلف خطوں سے جاری کئے۔مولانا عامر عثمانی کو خداداد صلاحیت ملی تھی جس کی وجہ سے انہیں نظم ونثر میں ملکہ حاصل تھی۔وہ ایک بے باک ناقد کی حیثیت سے اپنی مثال آپ تھے۔آپ کسی بھی تحریر پر بغیر کسی انسیت کے بے باکانہ انداز میں تنقید کرتے اور آپ کے انداز نقد میں توازن اور استدلال ملتا ہے۔مولانا عامر عثمانی جس طرح نثر میں قدرت رکھتے تھے اسی طرح فطرت نے ان کو ایک موزون طبیعت ودیعت کی تھی،جس کی وجہ سے مولانا اپنے تخیلات کو صحیح اور مترنم کرنے میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔انہوں نے شعر گوئی کو

مقاصد کی تکمیل کے لئے بروئے کار لایا اور اس میں کامیاب بھی ہوئے۔مولانا نے اپنے کلام میں معاشرے کی سچی تصویر کشی کی ہے اور ملت اسلامیہ کی حالت زار کا رونا رویا ہے۔

کارخانہ فطرت ......اقبال کی نظر میں:

یہ مضمون ۴ مارچ ۲۰۱۵ء کو روزنامہ کشمیر عظمیٰ میں شائع ہوا۔ زیر نظر مضمون میں بشیر احمد نحوی نے اقبال کے نظریہ کارخانہ فطرت کو موضوع بنایا ہے۔ اقبال کے نظام فکر کی اساس کارخانہ قدرت کے اس خلاق اعظم کی حقیقت ابدی سے جڑی ہوئی ہے، جس نے مظاہر فطرت کو رنگارنگی، رعنائی اور شادابی عطا کر کے کائنات کو آراستہ کیا ہے۔ بشیر احمد نحوی لکھتے ہیں کہ علامہ اقبال نے بعض مقامات پر خدا کا نام لئے بغیر ان تخلیقی مظاہر و مناظر کی شاندار الفاظ میں ترجمانی کی ہے، جو مناظر، مقامات اور اماکن کی ذاتِ بابرکات پر دلالت کرتے ہیں۔انہوں نے کارخانہ فطرت کے حوالے سے اپنی بعض شہکار نظموں میں جابجا تصویر کشی کی ہے۔ ایسی نظموں میں ہمالیہ، عہد طفلی، ایک پہاڑ اور گلہری، شمع و پروانہ، آفتاب شمع، پیام صبح وغیرہ شامل ہیں۔

اقبال کے پانچ پسندیدہ تاریخی شہر:

یہ مضمون ۱۱ مارچ ۲۰۱۵ء کو روزنامہ کشمیر عظمیٰ میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں بشیر احمد نحوی نے ان پانچ شہروں کا ذکر کیا ہے جن کا تذکرہ ہمیں اقبال کے کلام میں ملتا ہے اور ان کے حوالے سے کلام اقبال میں ایک مکمل نظم ''بلاد اسلامیہ'' کے عنوان سے ہے۔ اپنے کلام

میں اقبال نے ان پانچ تاریخی شہروں کی عظمت تاریخ کے آئینے میں بیان کی ہے۔ان شہروں میں سب سے پہلے دہلی کا تذکرہ ملتا ہے جسے علامہ نے سلام کی خانقاہ کہہ کر پکارا ہے۔ دوسرا شہر بغداد، تیسرا شہر قرطبہ۔ان تاریخی اور تہذیبی اہمیت کے حامل شہروں کی عظمت، شان رفتہ اور جلالت کی گمشدگی اور زوال پذیری پر علامہ نے خون کے آنسو بہائے ہیں۔قرطبہ کے بعد جس شہر کا علامہ نے ذکر کیا ہے' وہ قسطنطنیہ ہے۔علامہ اسے مسلمانوں کی صدیوں پر پھیلی ہوئی محنت، جدوجہد کا حاصل گردانتے ہیں۔ یہ شہر میزبان رسولؐ حضرت ایوب انصاریؓ کی ابدی آرام گاہ ہے۔نظم کے آخر میں جس شہر کا ذکرِ جمیل ملتا ہے وہ شہر مدینہ ہے جسے اقبال خواب گاہ مصطفیؐ، ولادت گاہِ عظمت اور مرکز نور کے ناموں سے یاد کرتے ہوئے اپنے طائرِ فکر کو اسی شہر کے کوہ و بیاباں میں دوڑاتے ہیں۔

مرحوم ومغفور مظفر خادم ......لوح یاداشت سے:

زیرنظر مضمون ۱۸ مارچ ۲۰۱۵ء کو روزنامہ کشمیر عظمیٰ میں شائع ہوا ہے۔اس میں بشیر احمد نحوی مرحوم مظفر خادم سے اپنی پہلی ملاقات اور دیگر احوال بیان کرتے ہیں۔نحوی کا کہنا ہے کہ تیس سال پہلے میرواعظ کے دولت خانے پر میری مرحوم مظفر خادم سے ملاقات ہوئی۔ خادم صاحب پیشے سے تاجر تھے مگر ان کے اندر قدرت نے ایک باصلاحیت عالم پیدا کیا تھا۔ وہ ملت اسلامیہ کے خیرخواہ اور اقبال کے شیدائی تھے۔ وہ درس قرآن و حدیث میں ڈاکٹر اسرار جیسے قدآور اسلامی اسکالر سے فیض یاب تھے۔ خادم کی ادب دوستی کے بعد نحوی ان سے اپنی قربت پر بات کرتے ہیں اور ساتھ ہی افسوس ظاہر کرتے ہیں کہ کئی بار ان سے

ملاقات کرنی چاہی ،لیکن ملازمت اور دیگر مصروفیات کی وجہ سے وہ لمحے نصیب نہ ہوئے۔

کشمیر یونیورسٹی ......یکم اپریل کی یادگار تعلیمی تقریب:

یہ مضمون روزنامہ کشمیر عظمیٰ میں ۱۵اپریل ۲۰۱۵ء کو شائع ہوا۔ اس مضمون میں پروفیسر موصوف نے کشمیر یونیورسٹی میں یکم اپریل کو منعقدہ تقریب کی ایک مختصر رپوٹ پیش کی ہے۔اس تقریب میں یونیورسٹی کی طرف سے ہندستان کے مشہور کیمیا دان نگیسا رراما چندر راؤ کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا گیا۔ یہ وہی کیمیا دان پروفیسر راؤ ہے جنہیں اب تک ۶۰ سے زائد یونیورسٹیوں سے ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں ملی ہیں۔انہوں نے اب تک کیمیا پر ۴۰ کتابیں اور ۶۰۰ سے زائد تحقیقی مقالے لکھے ہیں۔ پروفیسر راؤ نے کشمیر یونیورسٹی کی جانب سے اس اعزازی ڈگری کے ملنے پر خوشی کا اظہار کیا۔تقریب میں یونیورسٹی کے وی۔سی نے اس بات پر زور دیتے ہوئے لکھا ہے کہ کسی بھی تحقیقی کام کے لئے جدید سہولیات کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ پروفیسر نحوی نے امید ظاہر کی ہے کہ یونیورسٹی کے مختلف شعبہ جات میں جدید سہولیات کو لازمی بنایا جائے گا۔

شباب کشمیر......نگاہ طائرانہ:

زیر نظر مضمون ۲۹ اپریل ۲۰۱۵ء کو روزنامہ کشمیر عظمیٰ میں شائع ہوا۔اس مضمون میں کالم نگار نے کشمیر کے مشہور اور نامور مورخ منشی محمد الدین فوق کی کتاب ''شباب کشمیر'' پر تبصرہ پیش کیا ہے۔کالم نگار لکھتے ہیں کہ منشی محمد فوق نے یوں تو بعض تاریخی کتب تحریر کر کے داد

تحسین و حاصل کی ہے، جن میں تاریخ کشمیر (۳ جلدیں) تاریخ پونچھ، تاریخ اقوام کشمیر۔ موخرالذکر کتاب کی ایک کاپی فوق نے علامہ اقبال کو رائے کے لئے بھیجی تھی، جس پر اقبال نے جواباً لکھا تھا کہ یہ کتاب لکھ کر آپ نے کشمیری مسلمانوں کے لٹریچر پر احسان کیا ہے۔ آگے مضمون نگار لکھتا ہے کہ ''شباب کشمیر'' میں فوق نے بڈشاہی دور کے حالات و واقعات اور طرز حکومت میں انصاف پروری اور اعلیٰ انتظامی کارگردگی کے واقعات و کوائف کو پیش کیا ہے۔ کالم نگار مزید لکھتے ہیں کہ ''شباب کشمیر'' میں انتہائی اختصار کے ساتھ عہد قدیم میں کشمیر کے مذاہب، وسطی ایشیاء کے ساتھ یہاں کے تجارتی تعلقات، عوام کے اقتصادی و عمرانی مسائل اور بین المذہبی مذاکرات پر تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ایک اچھا خاصا مواد فراہم کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد اس بات کا بھی احساس ہوتا ہے کہ کشمیری عوام طبعاً شریف النفس، محنت کشی اور اعلیٰ صلاحیتوں سے آراستہ ہیں اور اپنی خداداد صلاحیت سے اپنی ذہانت کا لوہا منوا چکے ہیں۔

پروفیسر عبدالحق۔۔تعمیری ادب و اقبالیات کا معروف ترجمان:

یہ مضمون ۱۶ ستمبر ۲۰۱۵ء کو شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں پروفیسر نحوی نے دہلی یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ پروفیسر عبدالحق کی تعلیمی و تدریسی خدمات، سخن سنجی اور اقبال فہمی پر اظہار خیال کیا ہے۔ نحوی کا کہنا ہے کہ پروفیسر عبدالحق گزشتہ نصف صدی سے اردو شعر و ادب کی تعلیم و تدریس کا فریضہ بڑی ذمہ داری اور دیانت داری سے انجام دے رہے ہیں۔ وہ علم و آگہی کے اس عمل میں علامہ اقبال کے افکار و احوال کی سرگزشت کا بیان نہایت

بے باکی سے کرتے ہیں۔ پروفیسر عبدالحق اقبال کے نظامِ فکر سے والہانہ محبت رکھتے ہیں اور دانشوری کی صفات سے متصف ہونے کے لئے طلباء و طالبات اور اساتذہ کو کلام اقبال کا مطالعہ کرنے پر ازحد زور دیتے ہیں۔ اقبالیات پر پروفیسر موصوف کی کتابوں میں ''اقبال کی فکری سرگزشت'' اور ''شاعر رنگین نوا'' قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے دیوان حاتم مرتب کر کے داد و تحسین حاصل کی ہے۔ پروفیسر عبدالحق کی اقبال شناسی، تنقید نگاری، ادب نوازی، سخن سنجی کو موجودہ دور کے بیشتر ناقدین نے داد و تحسین دی ہے۔

پہلگام ......حسن فطرت کا مقام:

زیر نظر مضمون ۱۵ اگست ۲۰۱۵ء کو روزنامہ کشمیر عظمیٰ میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں نحوی کشمیر کے شہرت یافتہ صحت افزاء مقام پہلگام کی خاصیتیں بیان کرتے ہوئے اعترافاً اقبال اور عرش ملسیانی کے اشعار پیش کرتے ہیں۔ نحوی جہاں پہلگام میں قدرتی حسن کا حظ لیتے ہیں وہیں چند چیزوں پر افسوس بھی ظاہر کرتے ہیں۔ جہاں قدرت نے اپنے نرالے حسن کے منظر دکھا کر ناظرین اور زندہ دل لوگوں کے لئے مسرت کا سامان مہیا کیا ہے، وہیں خود غرض عناصر اور ناکارہ حکومت اپنے اغراض و مقاصد کی خاطر اس کے قدرتی حسن کو مٹانے پر تلے ہیں۔ بشیر احمد نحوی جہاں ایک آنکھ سے اس حسین و دلفریب وادی کے قدرتی حسن کا مزہ لوٹتے ہیں، وہیں دوسری آنکھ سے ان مسائل اور دیگر نقطوں پر نگاہ رکھتے ہیں، جن سے ہمارے معاشرے میں بدعنوانیاں پھیلتی ہیں۔ جہاں وہ ایک طرف اس وادی کے برف سے ڈھکے اونچے اونچے کوہسار دیکھتے ہیں وہیں دوسری طرف وہ ان مفلوک الحال بچوں کو بھی

دیکھتے ہیں جو اپنی مفلسی کی داستان سناتے ہیں۔

رحمدلی اسلاف کی نشانی اور پاکیزگی:

یہ مضمون ۱۹ اگست ۲۰۱۵ء کو شائع ہوا۔ اس میں پروفیسر نحوی رحمدلی کو ہمارے اسلاف کی خاص نشانی بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ہمارے اسلاف کے مثالی کردار کی جھلکیاں ہی رحمدلی کی پہچان کراتے ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں' جن کی رحمدلی، پاکیزگی اور پارسائی نے لاکھوں دلوں کی کایا پلٹ دی تھی' جو ایثار کے پیکروں میں تبدیل ہوگئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اسلام کے ہمہ گیر انقلاب کی اصل بنیاد اس کے اعلیٰ اخلاقی اصولوں، پاکیزگی اور رحمدلی کی شاندار قدروں اور پاک ملت کی بے مثال زندگیوں پر قائم ہے۔

سیلاب ستمبر...... یادِ ماضی عذاب ہے یارب:

۲ ستمبر ۲۰۱۵ء کو روزنامہ کشمیر عظمیٰ میں نحوی کے کالم میں شائع ہونے والا یہ مضمون ستمبر ۲۰۱۴ء کے سیلاب کا نقشہ کھینچتا ہے۔ جب ستمبر ۲۰۱۴ء میں پانچ دن تک مسلسل نہ رکنے والی موسلا دھار بارش نے پورے کشمیر کو اپنی لپیٹ میں لیا، تو دیکھتے ہی دیکھتے بستیوں کی بستیاں زیر آب آگئیں، ہر طرف خوف وحشت، ہلاکت، بربادی، بے سروسامانی اور نظام قدرت کے آگے انسان کی بے بسی کے مناظر سامنے آرہے تھے۔ اس ناگہانی آفت پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے نحوی لکھتے ہیں کہ ارض کشمیر جغرافیائی اور موسمیاتی اعتبار سے بار بار ایسی آفات کا شکار ہوسکتی ہے۔ ایسی صورت میں یہاں کے ہر باشندے پر یہ انسانی اور

اخلاقی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ قدرت کے مربوط اور متوازن نظام کے ساتھ کھلواڑ کرنے سے گریز کرے اور جنگلوں، آبی پناہ گاہوں، ندی نالوں، جہلم کے کناروں اور سبزہ زاروں کو اپنی ہوس اور دنیا پرستی کا شکار نہ بنائے۔ دوسری جانب حکومت کے پاس ایسے بے شمار وسائل ہیں جن سے ایسی ناگہانی آفات کے مواقع پر لوگوں کے جان و مال کو بڑی حد تک ظ رکھا جا سکتا ہے۔ وقت کی ضرورت یہ ہے کہ اس پر کھلے دل سے توجہ مرکوز کی جائے۔

اقبال کے دو محبوب اساتذہ......مولوی میر حسن و پروفیسر آرنلڈ :

زیرِ نظر مضمون ۱۶ ستمبر ۲۰۱۵ کو شائع ہوا ہے۔ اس میں بشیر احمد نحوی نے علامہ کے دو چہیتے اساتذہ کا تذکرہ کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کسی بھی بڑی شخصیت کے بنانے میں اس کے اساتذہ کا خاص رول ہوتا ہے' جس کی مثال ہمارے سامنے اقبال کی ہے۔ اقبال اگر اقبال ہے' تو میر حسن اور پروفیسر آرنلڈ کی وجہ سے، انہوں نے اقبال کی ذہنی نشوونما کی۔ اپنے دعوے میں نحوی نے نظیری کا شعر پیش کیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے' کہ اگر مدرس کا طریق تدریس محبت کا چشمہ زمزم ہو تو ایک طالب علم مدرسے میں تعطیل کے دن بھی آنے کی کوشش کرے گا' اپنے مضمون میں بشیر احمد نے افسوس ظاہر کیا ہے کہ آج کے دور میں ایسے اساتذہ کا قحط ہے اور اس طرح اساتذہ کی اہمیت گھٹ گئی ہے اور تعلیم و تدریس محض مادی اور معاشی ضرورت کا پیشہ بن گیا ہے۔

کشمیر......فلاحی و خیراتی اداروں کی افادیت و معنویت :

یہ مضمون ۳۰ ستمبر ۲۰۱۵ء کو روز نامہ کشمیر عظمیٰ میں شائع ہوا ہے۔اس مضمون میں نامہ نگار نے کشمیر میں فلاحی و خیراتی اداروں کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔اس میں مضمون نگار نے کہا ہے کہ ایک طرف کشمیر میں غربا اور مساکین بڑی مشکل سے روزانہ معمولاتِ زندگی کا گزارہ کر پاتے ہیں تو دوسری طرف صاحب ثروت اور امراء عیش وعشرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔اگر مسلم قانون کے حساب سے ہر صاحب ثروت اور مالدار اپنی دولت اور کمائی کا صدقہ،عشر،زکوۃ ادا کرتا تو کشمیر کا ہر ایک فرد خوشی خوشی اپنی زندگی گزار پاتا اور یہاں جو بھیک اور گداگری کی بدعت بڑھ رہی ہے' اس کا نام ونشان مٹ جاتا۔مضمون نگار اپنے مضمون میں کشمیر میں فلاحی اور خیراتی اداروں کی بڑھتی ہوئی افادیت اور اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ کشمیر کے موجودہ سماجی،سیاسی اور اقتصادی منظر نامے میں ان اداروں،انجمنوں اور تنظیموں کی افادیت وضرورت بڑھ گئی ہے کیونکہ آبادی کی ایک کثیر تعداد گوناگوں مشکلات سے دوچار ہے۔

تہذیب کا کمال شرافت کا زوال: یہ مضمون ۱۴ اکتوبر ۲۰۱۵ء میں کشمیر عظمیٰ میں شائع ہوا۔اس میں مضمون نگار عصر حاصر کے جدید سائنس وتکنالوجی سے پیدا شدہ آسائش سے خاطر خواہ متاثر بھی ہیں اور اس کے معترف بھی ہیں' لیکن اس کے باوجود مقالہ نگار کے دل میں ایک کسک ہیں کہ اس تکنالوجی سے یہ معاشرہ ترقی کے بجائے تنزل کا شکار ہو گیا۔انسان جدید مادی وسائل کے عروج کی طرف تو نظر آتا ہے لیکن اس صورت حال میں انسان اس طرح جکڑ گیا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے حصار سے باہر قدم ہی نہیں رکھ پاتا اور اس

طرح مجموعی طور پر یہ معاشرہ صالح قدروں، شرافت، دیانت داری، صداقت، سخاوت سے محروم ہوا جا رہا ہیں۔

جسٹس جاوید اقبال مرحوم ۔۔۔ایک عہد، ایک تاریخ: یہ مضمون ۷ اکتوبر ۲۰۱۵ء کو روز نامہ کشمیر عظمیٰ میں شائع ہوا۔اس مضمون میں پروفیسر نحوی علامہ اقبال کے فرزند ارجمند کی وفات پر دکھ کا اظہار کرتے ہوئے اسے ایک عہد کے اختتام سے تعبیر کرتے ہے۔جسٹس جاوید اقبال ایک ماہر قانون دان، ہونے کے علاوہ اعلیٰ پایہ کے دانشور، متکلم اور اپنے والد کے افکار ونظریات کے شارح بھی تھے۔علامہ نے اپنی تصنیف ''جاوید نامہ'' میں اسی فرزند ارجمند کے نام 'جاوید سے خطاب' کے عنوان ایک بلیغ پیغام بیانیہ انداز میں دیا ہے۔اس میں بظاہر تو خطاب اپنے فرزند سے ہیں لیکن یہ پیغام تمام جوانان ملت کے لئے ہیں۔وہ پیغام یہ ہے کہ خودی نہ بیچ امیری میں نام پیدا کر۔

کلام شیخ العالم مع کھوٹ از غلام نبی گوہر کا ترتیب دیا ہوا شہکار: یہ مضمون ۲۱ اکتوبر ۲۰۱۵ء کو روز نامو کشمیر عظمیٰ میں شائع ہوا۔اس مضمون میں پروفیسر نحوی غلام نبی گوہر کی ترتیب دی ہوئی کتاب' کلام شیخ' کو سراہتے ہیں۔شیخ العالم کشمیر کے برگزیدہ روحانی بزرگ گزرے ہیں۔ان کے کلام کو کئی دانشوروں نے اب تک ترتیب دے کر اس میں نئے نئے ابعاد منعکس کئے ہیں۔ان کے کلام کو' کشمیری قرآن' سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔اس مدون کتاب میں غلام نبی گوہر نے صحت متن اور تشریح وتوضیح میں کوئی کمی روا

نہیں رکھی ہیں۔ مزید کالم نویس لکھتے ہیں کہ اس طرح سے گوہر صاحب نے کشمیر کے اس برگزیدہ اور روحانی بزرگ اور اس میراث کے تئیں ایک قابل قدر کام کیا ہیں اور اس طرح کے کاموں میں مزید وسعت آنی چاہئے۔

پیام مشرق سخنوری مشرق کا شہ پارہ: یہ مضمون ۲۸ اکتوبر ۲۰۱۵ء کو روز نامہ کشمیر عظمیٰ میں شائع ہوا۔ اس میں پروفیسر نحوی علامہ اقبال کی معتبر تصنیف ''پیام مشرق'' کی اہمیت کو جتاتے ہوئے اسے تقدیر حقائق ومعارف اور تخلیقی امکانات کا ایک حسین مجسمہ قرار دیتے ہیں' اور لکھتے ہیں کہ اس کے مطالعے سے قاری کا ذہن زندگی کی مختلف جہات کی طرف منتقل ہو کر راہ راست کی منزل کی جانب متوجہ بھی ہوتا ہے۔ یہاں پر مقالہ نگار زبان فارسی سے ناآشنائی کا افسوس ظاہر کرتے ہوئے اپنے خطے کی ایک بڑی بدقسمتی سمجھتے ہیں چونکہ ہماری اپنی تاریخ کے انمول خزینے' ہمارے اسلاف کے بیش بہا کا نامے اسی زبان میں قلم بند ہیں اس سے ناآشنائی براہ راست اپنی میراث سے ناآشنائی ہیں۔

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوع انسان کو: یہ مضمون ۴ نومبر ۲۰۱۵ء کو روز نامہ کشمیر عظمیٰ میں شائع ہوا۔ اس میں مضمون نگار انسان کی جبلی خصلت اور اس سے پیدہ شدہ برے نتائج پر لب کشائی کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہوس نے عصری دنیا کے نوے فیصد انسانی آبادی کو اپنی لپیٹ میں لیا ہیں' جس سے انسان نفسیاتی بحراں میں جکڑ گیا ہے۔ ہوس نے آدمی کی راتوں کی نینداور دن کا چین اڑا دیا ہے۔ اسے وحشی اور سیاہ دل بنا

دیا ہے اور اس طرح انسان انسانیت سے محروم ہو کر ایک نرا حیوان بن چکا ہے۔

تعلیمی منصوبہ بندی: ہمہ گیر اصلاح وتغیر کی متقاضی: یہ مضمون ۱۸ نومبر ۲۰۱۵ء کو روز نامہ کشمیر عظمیٰ میں شائع ہوا۔اس میں مضمون نگار یورپ کی تعلیمی پالیسیوں اور اصولوں کو سرہتے ہیں کہ وہ پہلا درجہ تعلیم اور اس سے جڑے شعبہ جات کی اور دیتے ہیں اور اسی کے باعث ان کا تعلیمی نظام تمام دنیا کے لئے ایک آئیڈل بن چکا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ مضمون نگار اپنی تعلیمی منصوبہ بندی کی ناکسی پر نالاں ہیں۔ ہمارے یہاں کوئی جامع تعلیمی منصوبہ نہ ہونے کی وجہ سے ہمارا تعلیمی نظام اساتذہ' طلباء' والدین اور قوم کے لئے تنزل کی عام جگاہ بن گیا ہے۔ پروفیسر موصوف اس امر کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بتانے کوشش کرتے ہیں کہ جہاں حکومت کو اس کی بہتری کی اور توجہ کرنی چاہئے' وہیں اساتذہ ' طلباء اور ان کے والدین کو بھی اپنی اپنی جگہ ذمہ دار بن جانا چاہئے۔

جرمن شاعر گوئٹے ۔۔۔تعلیمات نبویؐ کا مغربی مداح: یہ مضمون ۲ دسمبر ۲۰۱۵ء کو روز نامہ کشمیر میں شائع ہوا۔اس میں مقالہ نا گار لکھتے ہیں کہ غیر مسلم اقوام میں متعدد ادیب' دانشور اور سخنور ایسے گزرے ہیں' جنہوں نے تعصب اور تنگ نظری کو چھوڑ کر کشادہ دلی اور روشن ضمیری کا مظاہرہ کر کے اسلام کے عظیم الشان پیغام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی آفاقی قدروں پر مبنی تعلیمات کو اپنی تحاریر میں شامل کیا ہے۔انہی سخنوروں میں گوئٹے قابل ذکر ہیں۔جنہوں نے اپنے ایک نامکمل اسلامی ڈرامے میں'' نغمہ محمدؐ'' کے

عنوان سے ایک مدحیہ نظم تحریر کی ہے۔ اس نظم میں گوئٹے نے پیغمبر عربیؐ کے پیغامِ رحمت کا ذکر جمیل کیا ہے۔

وقت ۔۔۔تکوینی اور حسیاتی تصور: زیر نظر مضمون روز نامہ کشمیر عظمیٰ میں ۳۰ دسمبر ۲۰۱۵ء کو شائع ہوا۔ اس میں مضمون نگار وقت کے تکوینی اور حسیاتی تصور پر لب کشائی کرتے ہیں چنانچہ وقت کی اہمیت' ماہیت' کیفیت ہر دور کے مفکرین کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ وقت کی ابتدا کب ہوئی اور کب اس کی آخری منزل ہوگی' سوائے خالق کائنات کے کوئی نہیں جانتا۔ مضمون نگار اپنے مضمون میں وقت کی اہمیت بیان کرتے ہیں۔ انسانی زندگی میں نظام الاوقات ترتیب دینے سے آدمی کے انتہائی قیمتی لمحات کو بچا کر انہیں حسنات میں بروئے کار لاکر ایک کارآمد اور پر از طمانیت زندگی گذارا جاسکتا ہے۔ زندگی کا ایک ایک لمحہ اور ایک ایک دقیقہ بیش بہا ہے اور اسے اچھائیوں میں استعمال کرنا چاہئے اور ماہ وسال کی صحیح قدروقیمت کا تقاضا بھی یہی ہے۔

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی اک گھٹا دی

حوالہ جات

۱۔: کشمیر میں اقباشناسی کا سفر از ڈاکٹر پیر نصیر احمد ص ۱۲۲۔۱۲۱
۲۔: بحوالہ مضمون از محمد مجید اندرابی بہ عنوان میرا اہم سفر: تخلیقی سفر کے زیر و بم میں
۳۔: ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ یضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ایضاً
۴۔: احساس وادراک از بشیر احمد نحوی ص ۱۶۳
۵۔: محسوسات از بشیر احمد نحوی ص ۱۱۴
۶۔: جموں وکشمیر کے اردو مصنفین از جان محمد آزاد ص ۳۲۱
۷۔: محسوسات از بشیر احمد نحوی ص ۱
۸۔: ایضاً۔۔۔ ایضاً ص ۱۱۴
۹۔: جامعہ کشمیر اور اقبالیات از بدرالدین بٹ ص ۵۱۶
۱۰۔: بحوالہ محسوسات از بشیر احمد نحوی ص ۱۱۴
۱۱۔: جامعہ کشمیر اور اقبالیات از بدرالدین بٹ ص ۵۱۶
۱۲۔: بحوالہ محسوسات از بشیر احمد نحوی ص ۱۱۴
۱۳۔: جامعہ کشمیر اور اقبالیات از بدرالدین بٹ ص ۵۱۸
۱۴۔: ایضاً۔۔۔۔۔۔۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔ ص ۵۱۷
۱۵۔: بحوالہ پروفسر مرغوب بانہالی بحیثیت اقبال شناس از پیر نصیر احمد ص ۱
۱۶۔: بحوالہ مضمون از سید محمد اندرابی غیر مطبوعہ

۱۷۔: اقبالیات کے گزشتہ دس سال مرتب بشیر احمد نحوی ص ۱۵۴

۱۸۔: بحوالہ مضمون از سید محمد فضل اللہ مطبوعہ کشمیر یونیورسٹی

۱۹۔: بحوالہ اقبایات گزشتہ دس سال از بشیر احمد نحوی ص ۱۵۳

۲۰۔: بحوالہ ارمغان نحوی از بشیر احمد نحوی ص ۳۷۰

۲۱۔: جامعہ کشمیر اور اقبالیات از بدر الدین بٹ ص ۳۳۷

۲۲۔: اقبال عرفان کی آواز از بشیر احمد نحوی مقدمہ

۲۳۔: شخصی انٹرویو از بشیر احمد نحوی بمقام سرینگر تاریخ ۷-۱-۲۰۱۴ء بوقت ۲ بجے

۲۴۔: مضمون از ریاض توحیدی ہندوارہ کشمیر مطبوعات اقبال انسٹی ٹیوٹ

۲۵۔: جہاں اقبال از ریاض توحیدی ص ۶۳-۱۶۲

۲۶۔: اقبایات شمارہ ۱۳ از بشیر احمد نحوی ص ۲-۱

۲۷۔: چشمہ افتاب مرتبہ غلام رسول ملک، بشیر احمد نحوی ص ب

۲۸۔: اقبال کی تجلیات مرتبہ بشیر احمد نحوی پیش لفظ

۲۹۔: شخصی انٹرویو از بشیر احمد نحوی بمقام سرینگر تاریخ ۳-۳-۱۴ بوقت ۲:۳۵

۳۰۔: بیاد خواجہ محمد امین بچھ مرتبہ غلام رسول ملک، بشیر احمد نحوی ص ۲۶-۲۵

۳۱۔: اقبایات گزشتہ دس سال از بشیر احمد نحوی ص ۱۶۲

۳۲۔: اقبالیات شمارہ نمبر ۱۷ مرتبہ بشیر احمد نحوی ص اداریہ

۳۳۔: کشمیر میں اقبالیات کا سفر از پیر نصیر احمد ص ۱۳۴

۳۴۔: چشمہ آفتاب مرتبہ غلام رسول ملک ، بشیر احمد نحوی پیش لفظ

۳۵۔: کشمیر میں اقبال شناسی کا سفر از پیر نصیر احمد ص ۳۶

۳۶۔: وہ دانائے سبل ختم رسل مرتبہ بشیر احمد نحوی ص ۱

۳۷۔: جامعہ کشمیر اور اقبالیات از بدر الدین بٹ ص ۴۳-۳۴۲

۳۸۔: ایضاً۔۔۔ایضاً۔۔۔ص ۴۴-۳۴۳

۳۹۔: ایضاً۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔ایضاً

۴۰۔: وہ دانائے سبل ختم رسل مرتبہ بشیر احمد نحوی ص ۲

۴۱۔: ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً ص ۴۱

۴۲۔: ایضاً۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔ص ۴۲

۴۳۔: جامعہ کشمیر اور اقبایات از بدر الدین بٹ ص ۳۵۰

۴۴۔: ایضاً۔۔۔۔۔یضاً۔۔۔ص ۳۵۳

۴۵۔: ایضاً۔۔۔۔۔۔یضاً۔۔ ص ۳۵۸

۴۶۔: ایضاً۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔۔ص ۳۶۲

۴۷۔: ایضاً۔۔۔ایضاً۔۔۔ایضاً

۴۸ ۔: ایضاً۔۔۔۔۔ ایضاً۔۔۔ص ۳۶۵

۴۹ ۔: اقبایات کے گزشتہ دس سال مرتبہ بشیر احمد نحوی پیش لفظ

۵۰ ۔: ایضاً۔۔۔ ایضاً۔۔ ایضا

۵۱ ۔: ایضاً۔۔۔ ایضاً۔۔۔ ایضاً

۵۲ ۔: فکر آزد مرتبہ بشیر احمد نحوی پیش لفظ

۵۳ ۔: یضاً۔۔۔ یضاً۔۔۔۔۔ص ۲

۵۴ ۔: ایضاً۔۔۔۔۔۔۔ یضاً۔۔۔۔۔ص ۹۲

۵۵ ۔: بحوالہ مضمون از ریاض توحیدی مطبوعات کشمیر یونیورسٹی

۵۶ ۔: کشمیر میں اقباشاسی کا سفر از پیر نصیر احمد ص ۴۷

۵۷ ۔: جامعہ کشمیر اور قبالیات از بدرالدین بٹ ص ۵۵۳

۵۸ ۔: نظریہ تصوف اور اقبال از بشیر احمد نحوی حروف آغاز طبع دوم ۲۰۱۱ء

۵۹ ۔: ایضاً۔۔۔۔۔۔ یضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔پیش لفظ

۶۰ ۔: ایضاً۔۔۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص ۱۰، ۱۲، ۱۴

۶۱ ۔: ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔ص ۲۳

۶۲ ۔: ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔ص ۳۴

۶۳ ۔: نظریہ تصوف اور اقبال از بشیر احمد نحوی ص ۱۶۷

۶۴ ۔: اقبالیات گزشتہ دس سال مرتبہ بشیر احمد نحوی ص ۶۹

۶۵ ۔: نظریہ تصوف اور اقبال از بشیر احمد نحوی ص ۱۷۱

۶۶ ۔: ایضاً۔۔۔۔۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔ص ۱۶۱

۶۷ ۔: ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ ایضاً۔۔ص ۱۲۰

۶۸ ۔: ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ ایضاً۔۔ص ۱۲۱

۶۹ ۔: پیش آہنگ از سید رسول پونپر ص ۱۲۹۔۲۸

۷۰ ۔: اقبال افکار و احوال از بشیر احمد نحوی انتساب

۷۱ ۔: ایضاً۔۔۔۔۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔ص ۱

۷۲ ۔: محسوسات از بشیر احمد نحوی ص ۲

۷۳ ۔: اقباافکار و احوال از بشیر احمد نحوی ص ۷۶

۷۴ ۔: ایضاً۔۔۔۔۔ ایضاً۔۔۔ص ۸۰

۷۵ ۔: ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ ایضاً۔ص ۸۶

۷۶ ۔: پیش آہنگ از سید رسول پونپر ص ۱۲۶

۷۷ ۔: ایضاً۔۔۔۔۔ ایضاً۔۔۔ ایضاً

۷۸ ۔: مشمولہ مضمون از سید محمد فضل اللہ مطبوعات اقبال انسٹی ٹیوٹ

۷۹؎: اقبال عرفان کی آواز از بشیر احمد نحوی ص ۴۔۳

۸۰؎: ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔۔ص ۱۶

۸۱؎: ایضاً۔۔۔۔۔۔یضاً۔۔ص ۳۶

۸۲؎: ایضاً۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔۔ایضاً

۸۳؎: ایضاً۔۔۔ایضاً۔۔۔ص ۴۶

۸۴؎: ایضاً۔۔۔ایضاً۔۔۔۔ایضاً

۸۵؎: جہان اقبال از ریاض توحیدی ص ۶۳۔۱۶۲

۸۶؎: اقبال عرفان کی آواز از بشیر احمد نحوی ص ۷۵

۸۷؎: بحوالہ مضمون از عبدالحق مطبوعات اقبال انسٹی ٹیوٹ

۸۸؎: وحدت الوجود اور اقبال از بشیر احمد نحوی ص ۱۳۔۱۲

۸۹؎: ایضاً۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص ۸۹

۹۰؎: ایضاً۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص ۱۰۷۔۱۰۶

۹۱؎: بحوالہ مضمون از سید فضل اللہ مطبوعات اقبال انسٹی ٹیوٹ

۹۲؎: اقبال ایک تجزیہ از بشیر احمد نحوی ص ۹

۹۳؎: ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔یضاً۔۔ص ۴۱

۹۴؎: محسوسات از بشیر احمد نحوی ص ۵

۹۵؎: ایضاً۔۔۔ایضاً۔۔۔ص ب

۹۶؎: ایضاً۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص ۳

۹۷؎: ایضاً۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔ص ۸

۹۸؎: احساس وادراک از بشیر احمد نحوی پیش لفظ

۹۹؎: ایضاً۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔ص ۳

۱۰۰؎: ایضاً۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔ص ۱۳

۱۰۱؎: ایضاً۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔ص ۷۰

۱۰۲؎: ایضاً۔۔۔ایضاً۔۔۔ص ۴۲

۱۰۳؎: ایضاً۔۔۔۔۔ایضاً۔۔ص ۲۷

۱۰۴؎: ایضاً۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔۔ص ۲۰۔۱۲۱

۱۰۵؎: احساس وادراک از بشیر احمد نحوی ص ۱۴۵

۱۰۶؎: ایضاً۔۔۔ایضاً۔۔۔ایضاً

۱۰۷؎: اقبالیات شمارہ ۱۷ مرتبہ بشیر احمد نحوی ص ۲

۱۰۸؎: اقبالیات شمارہ ۱۹ مرتبہ بشیر احمد نحوی ص ۱۲

۱۰۹؎: حکیم مشرق مرتبہ بشیر احمد نحوی ص ۶

۱۱۰ ؎: اقبال کی تجلیات مرتبہ بشیر احمد نحوی ص ب
۱۱۱ ؎: تاریخ انبیاءؑ مرتبہ بشیر احمد نحوی ص ۲۰۔۱۹
۱۱۲ ؎: ارمغان حجاز از بشیر احمد نحوی ص ۱۵
۱۱۳ ؎: ایضاً۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔ایضاً

باب پنجم

بشیر احمد نحوی مشاہیر، ناقدین و معاصرین کی نظر میں

پروفیسر بشیر احمد نحوی ریاست جموں وکشمیر کے ایک حساس ،سنجیدہ اور باذوق عالم کی حیثیت سے اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے اپنا لوہا منوایا ہے۔کسی نے انہیں حافظ قرآن کا لقب دیا،کسی نے حافظ اقبال،کسی نے اقبالیات کی طاقتور آواز،کسی نے مجسمہ خلق کریم،کسی نے حلیم صفات کا پیکر کہا،کسی نے سنجیدہ عالم،کسی نے شگفتہ بیانی کا نباض کہا،کسی نے دانش گاہ علم وآ گاہی کا وارث،کسی نے سخن شناس کہا،کسی نے ان کو

تواضع واحترام آدمیت کا جری سپاہی، کوئی ان کی تحریر کا شیدائی ہے تو کوئی ان کی تقریر کا۔ غرض ان کی علمی بصیرت اور ادبی خدمات کا ہر ذی شان انسان اعتراف کرتا ہے۔ انہوں نے اپنی علمی لیاقت اور ادبی سرگرمیوں سے اپنے بیشتر مشاہیر ناقدین اور معاصرین ادب کو رطب اللسان ہونے پر مجبور کیا ہے۔

مرزا غلام حسن بیگ عارف بشیر احمد نحوی کے حوالے سے یوں لکھتے ہیں:

''اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ مدتوں کی تمناؤں اور دُعاؤں کے بعد بجبہاڑہ اسلام آباد سے ایک آواز اُبھر آئی۔ایک جواں سال، باہمت علم وادب کا رسیا ڈاکٹر بشیر احمد نحوی کی صورت میں نمودار ہوا جس نے نہ صرف دیکھتے دیکھتے اپنے ہم عمر نوجوانوں کو اپنا ہم خیال اور ہمسفر بنایا بلکہ مجھ جیسے کئی کہنہ سال ادیبوں اور شاعروں کی رگوں میں جوانی کا خون دوڑایا۔''[۱]

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بشیر احمد نحوی سے مل کر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ان کا یوں ایک خط میں تعارف بیان کرتے ہیں:

''عنایت نامہ 10 نومبر 1981ء موجب منت وباعث مسرت ہوا۔آپ کی مرسلہ رپورٹ بھی پڑھی غالباً یہ پہلی سنجیدہ اور دیانت دارانہ رپورٹ ہے۔ میں اسے ڈاکٹر اشتیاق کے پاس بھیج رہا ہوں تاکہ وہ'' ندائے ملت'' میں شائع کرے۔

سرینگر میں جن لوگوں سے مل کرخوشی ہوئی اوران سے مانوس ہوا‘
ان میں آپ ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔‘‘۲؎

پر پروفیسر حامدی کاشمیری بشیر احمد نحوی کی شخصیت پر گفتگو کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

’’ڈاکٹر بشیر احمد نحویؔ کو میں گذشتہ کئی برسوں سے شخصی طور پر جانتا ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ وہ کشمیر کی نئی نسلوں کا ایک حساس عالم،سنجیدہ اور باذوق نمائندہ ہے۔ان کی شخصیت میں جہاں علم وفضل اورادب شناسی کا وقار ہے‘ وہاں وہ محبت،شفقت اورخلوص کے فطری خصائص سے ایک مخصوص دل آویزی رکھتے ہیں۔ انہوں نے حال ہی میں ملازمت اور دیگر مشکلوں کے باوجود اقبال اورتصوف کے موضوع پر پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کر لی ہے ان کے چند ادبی اور تحقیقی مضامین پر مشتمل کتاب ’’اقبال افکارواحوال‘‘ شائع ہورہی ہے اس میں علامہ اقبال کی شخصیت اورفکر وفلسفہ کے بعض نئے گوشوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔نحوی صاحب ایک فعال شخصیت کے مالک ہیں۔وہ کشمیر میں اقبال اکیڈیمی کے بنیادگزار ہیں۔اکیڈیمی کے تحت باقاعدہ جلسوں،مناظروں اورسیمیناروں کے انعقاد سے نہ

صرف علامہ اقبال کی حیات، پیغام اور شاعری عام و خاص میں مقبول ہو رہی ہے بلکہ فکر و نظر اور علم و دانش کی روشنی بھی پھیل رہی ہے اور اس کا سہرا ڈاکٹر نحوی کے سر ہے۔''۳؎

بشیر احمد نحوی کی ہمہ جہت شخصیت، انکی بلند نگاہی، دور اندیشی، جاں پرسوزی کی مثال آپ کی ہی شخصیت ہے۔ انجینئر جی آر میر (پاندریٹھن) ان کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''موجودہ دور اخلاقی اعتبار سے کھوکھلا ثابت ہو رہا ہے۔ قدریں مٹ رہی ہیں اور ہر طرف تاریکی کے خوفناک سائے نظر آتے ہیں۔ خاص طور پر اخلاقی، ادبی اور علمی سطح پر ایک فقدان نظر آتا ہے۔ ان حالات میں علامہ اقبال کا بے مثال کلام زندگی اور توانائی لے کر مردہ دلوں کے اندر نئی روح پھونکنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔۔۔ پر ہے کوئی جو ہمارے یہاں بھولے بھٹکے، محروم، مایوس نوجوانوں کو حقیقی معنوں میں اقبالیات کی طرف مائل کرے۔۔۔ ہاں اس گھٹن میں بھی امید کی ایک کرن نظر آتی ہے۔ کمزور و بے سروسامان سہی، مگر خلوص و عزم و یقین سے بھرپور میرے جواں سال عزیز دوست ڈاکٹر بشیر احمد نحوی پر سب کی نظریں لگی ہوئی ہیں۔ جنھوں نے اس کام کا بیڑہ اُٹھا کر ایک قابل تقلید مثال قائم کر دی ہے۔ خوش قسمتی سے مزاج شگفتہ، کلام

برجستہ میری نظر میں عالم بہ عمل کے سانچے میں ڈھلنے اور حدی خوان بننے کا حوصلہ رکھتے ہیں اور صلاحیت بھی۔

نگاہ بلند سخن دلنواز جاں پرسوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کیلئے

۴

بشیر احمد نحوی کو قدرت کی طرف سے علمی وادبی شعور اور حافظے کی خداداد صلاحیت ودیعت ہوئی ہے۔ان کی اس خصوصیت پر گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر شوریدہ کاشمیری لکھتے ہیں:

''بشیر احمد نحوی کی عزیمت وہمت اور شب وروز کی محنت قابل داد ہے۔مبداء فیض سے قوت حافظہ کی دولت بھی ودیعت ہوئی ہے۔شعراء کے سینکڑوں اشعار ازبر ہونے کے علاوہ کئی ادیبوں کی نثری عبارات بھی زبانی یاد ہیں۔نحوی کو علم وادب کے علاوہ دین و مذہب سے بھی بڑی دلچسپی ہے۔نگارشات میں شبلی وحالی کا ملا جلا رنگ جھلکتا ہے۔مضامین خطابی،صحافی،مقصدی واصلاحی نوعیت کے ہوتے ہیں،جن میں روانی اور برجستگی پائی جاتی ہے۔''۵

خواجہ محمد امین بچھ لکھتے ہیں:

''نحوی صاحب کو اللہ جل شانہ نے تحریر وتقریر دونوں پر ید طولیٰ عطا کیا ہے۔ ان کا حافظہ بڑا قوی ہے۔ وہ دوران تقریر رباعیات اور اشعار اس طرح دہراتے ہیں کہ دل سے ان کے لئے شاد باد کی دعا نکلتی ہے۔انھیں اساتذہ کی بہت سی نظمیں غزلیں، رباعیات اور قطعات ازبر ہیں جو انھیں تحریر وتقریر کے دوران کام آتی ہیں اور موضوع سنوارنے اورنکھارنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔نحوی صاحب کا قلم بڑا رواں دواں ہے۔ وہ سیاسیات،معاشیات،اقبالیات اورعلم ودین پر وسیع معلومات کے مالک ہیں۔نحوی صاحب اقبال اکیڈیمی کے روح رواں وجسم دواں ہے۔ ہم نے نحوی صاحب کا تعارف کرنے میں حقیقت کا اظہار کیا ہے مبالغہ بالکل نہیں۔''٦؎

پروفیسر نحوی کو اقبال کا تقریباً سارا کلام ازبر ہے۔اس کے علاوہ درجنوں شعراء، ادبائ، ناقدین، مفسرین، فلاسفہ کے درجنوں اشعار، اقتباسات، قصص وامثال، تراشے، آرائ، حکایات، خیالات ونظریات بھی ازبر ہیں۔ ان کی اس خصوصیت پر گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر مرغوب بانہالی لکھتے ہیں:

''پچھلی ایک دہائی کے دوران جن جواں سال اسکالروں کی علم دوستی، شعرفہمی اور شعر شناسی کو کشمیر کے اردو اور فارسی سے

وابستہ ادبی حلقوں میں بہت اچھی پذیرائی اور سراہنا ہوتی رہی ہے، ان میں ڈاکٹر بشیر احمد نحوی کا نام ایک گونا امتیاز کا حامل ہے۔ فارسی، اردو اور کشمیری زبانوں کے ہزاروں دلکش اشعار پوری صحت کے ساتھ از بر رکھنے والے ڈاکٹر نحوی نے ریاست بھر کے اقبال شناسوں کو یکجا کر کے جہاں اقبال اکیڈیمی قائم کرنے میں اساسی رول ادا کیا، وہاں کئی طرح کی مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے موصوف نے گذشتہ تین چار برسوں میں سرینگر، سوپور، اور اسلام آباد جیسے تہذیبی مراکز میں محض اپنے خلوص اور چند صاحب ایثار دوستوں کے عملی تعاون کی بدولت کئی شاندار اور دورس اثرات والی تقریبات کا اہتمام بھی کیا۔ میری دعا ہے کہ مادرِ کشمیر کے اس محنتی اور صالح فرزند کی کوششوں کو اللہ تعالیٰ برکت دے اور اس کے جذبہ خدمت کو وسیع تر دائرہ عمل میسر آجائے۔''۱۱؎

سید مجید اندرابی ان کی اسی خصوصیت کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

''حافظہ اس قدر قوی کہ شاعر مشرق کے کم وبیش دس ہزار اشعار زبانی یاد ہیں۔ اقتباسات، قصص وامثال تذکرہ نگاروں کے تراشے واقتباسات، ناقدین کی آرائ، مفسرین کے بین التفاسیر مطالعات، تاریخ اسلام کے اہم واقعات، اسلامی

> حکایات وغزوات، قدیم فلاسفہ کے خیالات ونظریات عربی شعر وادب کے علاوہ اخوان الصفا کے تذکرے، قلی قطب شاہی دور کی اردو سے لے کر حلقہ ارباب ذوق تک کے حالات وواقعات پر گہری نظر رکھنے والا نحوی کیا ہی لین الطبع ونرم مزاج انسان ہے۔''ے

پروفیسر بشیر احمد نحوی کی علمی وادبی خدمات کو ہمیشہ سراہا گیا ہے۔ ان کی تصانیف ، تالیفات ،مضامین ،تحریریں وتقریریں قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔انہوں نے اردو ادب بالعموم اور اقبالیات کو بالخصوص اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا ہے۔ ان ہی کی کوششوں سے ریاست میں اقبال اکیڈیمی کا قیام عمل میں آیا۔ان کی اس خدمت کوسراہتے ہوئے مظہرامام یوں لکھتے ہیں:

> اقبال اکیڈیمی جموں وکشمیر کا قیام ڈاکٹر بشیر احمد نحوی کی ذاتی، مساعی لگن اور دوڑ دھوپ کا نتیجہ ہے۔ پہلے ان کا سفر تنہا تھا۔اب دوسرے علم دوست بھی شامل ہو گئے ہیں اور ایک کارواں بنتا جارہا ہے۔ اقبال اکیڈیمی کا مقصد اقبال کے نور بصیرت کو عام کرنا ہے تا کہ ہمارا معاشرہ' جو پستی اور ذلت کی جانب گامزن ہے ' پھر سے اپنی اخلاقی اور تہذیبی قدروں کو بحال کر سکے۔ ڈاکٹر بشیر احمد نحوی خیابان جنت کشمیر کے ایک▭نورستہ ہے۔ اگر ان کا

ذوق، علم حاصل کرنے اور اسے پھیلانے کی لگن اور اخلاقی
قدروں پر ایمان اسی طرح سلامت رہے تو مجھے یقین ہے اس
پھول کی خوشبو اس خیاباں کی حدود سے نکل کر پورے برصغیر کے
مشام روح کو معطر کرے گی۔'' ۸؎

پروفیسر شوریدہ کاشمیری لکھتے ہیں:

''ان کی تحریک سے کشمیر میں اقبال اکیڈیمی وجود میں آ گئی
جس کے وہ خود جنرل سکریٹری ہیں اور جس نے 9 نومبر 1986ء
سے اپنے کام کا آغاز کیا۔ اکیڈیمی کے تحت وادی کے اطراف
واکناف میں آج تک کئی اہم ادبی تقاریب منعقد ہوئیں' جن میں
اہل علم ودانش کی ایک بڑی تعداد شرکت کرتی رہی۔ آخر میں دعا
ہے کہ حق تعالیٰ اس جواں سال ادیب وخطیب ظ و مامون
رکھے اور افعال لائقہ میں استحکام واستقلال بخشے۔'' ۹؎

پروفیسر بشیر احمد نحوی بچپن سے ہی اقبال کے شیدائی ہیں اور ان کے پیغام کو عوام الناس تک پہنچانا اپنا منصب سمجھتے ہیں۔ ان کی تحریک سے کئی بزرگ شعراء اور ادباء کے عزائم جوان ہوئے۔ مرزا عارف بیگ لکھتے ہیں:

''اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ مدتوں کی دعاؤں کے بعد بجبہاڑہ
اسلام آباد سے ایک آواز سنائی دی۔ ایک جواں سال، باہمت،

علم وادب کا رسیا آدمی نمودار ہوا جس نے نہ صرف دیکھتے دیکھتے اپنے ہم عمر نوجوانوں کو اپنا ہم خیال اور ہمسفر بنایا بلکہ مجھ جیسے کئی سال خوردہ ادیبوں اور شاعروں کی رگوں میں جوانی کا خون دوڑایا۔ جموں وکشمیر اقبال اکیڈیمی کا سنگ بنیاد ہم لوگوں سے ڈلوایا اور عزم صمیم سے اس کارواں کو خود ہی خواں بن کر وادی بھر میں حضرت اقبال کے پروانوں کے لئے شمع فیروزاں کی آج بہت کام ایسے کور ذوق ہوں گے، جو بشیر احمد نحوی صاحب کے نام سے مانوس نہیں ہوں گے۔ دوردرشن نے ان کے نام کے ساتھ ساتھ لوگوں کو ان کے خدوخال سے بھی روشناس کرایا۔'' ۱۰؎

پروفیسر بشیر احمد نحوی اپنے فکر ودانش اور ریاضت ونظامت کے بل پر اقبالیاتی ادب میں خاصا مقام رکھتے ہیں۔ وہ اپنی قابلیت اور محنت سے کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ اقبالیات کے ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے اور ان کی دور نظامت میں اقبالیات کے حوالے سے بیش بہا کام ہوا۔ ڈاکٹر ریاض توحیدی لکھتے ہیں:

''پروفیسر بشیر احمد نحوی صاحب کی نظامت کے دوران اس ادارے نے اقبالیات کے تعلق سے بیسیوں سیمینار، توسیعی خطبات اور مذاکرے منعقد کرائے، جن میں ہندوپاک کے علاوہ دوسرے ملکوں کی کئی نامور ہستیوں نے شرکت فرمائی۔ علاوہ

ازیں اس دوران متعدد کتابیں اور رسائل شائع ہوئے۔ یہ پروگرام آج بھی باقاعدگی کے ساتھ جاری ہے اس ادارے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے کتب خانے میں تقریباً وہ تمام کتابیں اور رسائل دستیاب ہیں، جو اقبالیات سے متعلق دنیا کے گوشے گوشے میں شائع ہوئے ہیں اور جن سے نہ صرف ادارے کے اسکالر فیض اُٹھاتے ہیں بلکہ دوسری یونیورسٹیوں میں اقبالیات پر تحقیق کرنے والے اسکالر بھی وقتاً فوقتاً انسٹی ٹیوٹ میں آکر تشفی بخش مواد حاصل کرتے ہیں۔'' ۱۱؎

پروفیسر نحوی متعدد تصانیف کے مالک ہیں۔ ان کی اہمیت مسلم ہے، خصوصاً ان کی کتاب مسائل تصوف اور اقبال۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ریاض توحیدی لکھتے ہیں:

''مسائل تصوف اور اقبال پروفیسر بشیر احمد نحوی صاحب کی ایک اعلیٰ پایہ کی تصنیف ہے۔ یہ تصنیف نہ صرف اقبالیاتی ادب بلکہ اسلامی تصوف پر تحریر شدہ کتابوں میں بھی ایک مخصوص مقام کی حامل ہے۔ آسان اسلوب میں تحریر کردہ یہ کتاب نہ صرف تصوف کے بنیادی مسائل سے واقفیت فراہم کرتی ہے بلکہ جدید علوم سے تعلق رکھنے والے افراد بھی اسلامی تصوف کے خدوخال سے آشنائی حاصل کرسکتے ہیں۔ اس کتاب میں مصنف نے علمی

وتحقیقی لوازمات کے ساتھ تصوف کے ماخذ، حقیقت، روایت اور مقصدیت پر بصیرت افروز روشنی ڈالی ہے اور تصوف سے متعلق غلط فہمیوں اور من گھڑت تشبیہات کا مفکرانہ اور محققانہ جائزہ لیتے ہوئے صوفیائے کرام کے تاثرات اور تفکرات کا بھی احاطہ کیا ہے۔'' ۱۲؎

پروفیسر نحوی کی دوسری اہم کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سید محمد فضل اللہ لکھتے ہیں:

''ایک اور اہم کارنامہ اقبال عرفان کی آواز ہے جو مختلف اور متنوع مضامین پر مشتمل ہے۔ان میں گہرے فکری موضوعات بھی ہیں اور عام پسندگی سے متعلق عنوانات پر بھی سادہ سلیس اسلوب نگارش سے آراستہ خیالات پیش کئے گئے ہیں جیسے اسرار ورموز میں قرآنی آیات، اقبال اور توحید وجودی کے ساتھ رہا صوفی گئ روشن ضمیری، رخت بہ کاشمر کشا وغیرہ موضوعات خاصے پرکشش ہیں۔ یہ مضامین وقتی فرمائش اور ضرورتوں کے تحت بھی لکھے گئے ہیں مگر ان میں پروفیسر صاحب کے محسوسات کی دنیا اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔اقبال سے ان کی قلبی وابستگی اور ایک گنا عقیدت کا عکس واظہار ہر عبارت اور ہر تعبیر کا جوہر بن کر ابھرتا ہے۔تعلق خاص کا یہ رشتہ وپیوند اپنے اقرار

واعتراف میں بہت ہی مستحکم ہے۔ اسی سبب فکر اقبال کی روح بے حجاب نظر آتی ہے۔ یہ شوق وشغف وقتی یا حادثاتی بھی نہیں ہے اور نہ ہی منصبی فیض کا نتیجہ ہے بلکہ ابتدائی تحریروں میں بھی اقدار سے یہ والہانہ انسیت بہت نمایاں ہے۔ قدروں کا احترام بھی انھیں مطالعہ اقبال کے لئے مہمیز کرتا ہے۔'' ۱۳؎

پروفیسر عبدالحق لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر صاحب کی دوسری تصنیف ''اقبال عرفان کی آواز'' اقبالیاتی ادب میں وہ اضافہ ہے جو عاشقان اقبال اور راہ روان سلوک اور طالبان آگہی کے لئے علامہ بے بدل شاعر مشرق اقبال کی شناخت کا سامان کئے ہوئے استاد کی طرح طالب علم کی انگلی پکڑ کر منزل کا رخ کئے ہوئے انوار عرفان سے منور کرتی ہے یہاں پر آکر ڈاکٹر صاحب کے قلم کے کرتب کی گہرائی و گیرائی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔'' ۱۴؎

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی ان کے حوالے سے فرماتے ہیں:

وہ ایک سچے عاشق اقبال کی حیثیت سے جہاں شاعر مشرق کے مثبت مکتب فکر کے ہر گوشے پر پڑنے والی روشنی کی طرف پروانہ وار لپکتے رہے ہیں وہاں وہ منفی مکتب فکر کی کوتاہی اور قباحت کو بھی

نشاندہی میں لاتے رہے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ نحوی صاحب عصر حاضر کے ایک باذوق کالم نگار کی حیثیت سے اپنی مثال آپ ہیں۔'' ۱۵ ؎

پروفیسر نحوی کی صائب سوچ اور فکر و تامل کی موجودہ کیفیات کی حکایات دلنواز ان کی تحریروں میں جابجا بکھری پڑی ہیں۔ ان کی تحریروں پر گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر عبدالحق یوں لکھتے ہیں:

''محسوسات'' ان کی ابتدائی کاوش قلم کا مرقعہ ہے۔ تحریر وتعبیر کی اس دہائی کا سفر روان خیال کو پرواز مدام کی جانب نغمہ ساربان کی طرف بشارتوں بھری آواز سے کم نہیں ہے۔ مختصر اور تاثراتی اظہار نے ان مضامین کو زندگی بخشی ہے ان اوّلین نقوش کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ شخصیت کے ارتقائی فکر کے تجزیے سے اس کے استقبال کی تصویر آفرینی آساں ہوجاتی ہے۔ مزاج' افتاد اور اس کے استقلال کی داستان بھی مرتب کی جاسکتی ہے۔ اس سے سلسلہ فکر انسانی کے ارتباط کا پتہ چلتا ہے اور غور وفکر کی راہیں بھی روشن کی جاسکتی ہیں۔ بصورت دیگر گمراہی اور درماندگی کے اسباب کی نشاندہی دشوار نہیں ہوتی معاشرہ میں انحراف اور مراجعات کی مثالیں بھی کم نہیں ہے۔ نحوی صاحب کی صائب

سوچ اورفکر وتعامل کی موجودہ کیفیات کی حکایت دلنواز ان تحریروں میں جابجا بکھری پڑی ہے ان کے ذہن کی ارتقاء پذیری کی پیش گوئی کے احوال ومقام سے ہم بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ ان نقوش میں گونا گوں پہلو ہے۔توحید رسالت' انسان کائنات، افرادکشمیر کے مظاہر ومناظر کے علاوہ بھی بہت سے موضوع قلمبند ہیں۔کہیں کہیں انشائیہ اسلوب بیان تخلیقی تحریر کا حریف بن جاتا ہے ان کے یہاں زبان کی کلاسیکی،پختگی کی بھی خاصے کی چیز ہے۔ میری رائے میں یہاں وہ ایک منفرد اسلوب واظہار کے مقام پر فائز دکھائی دیتے ہیں کیونکہ پروفیسرنحوی عربی وفارسی شعریات پر بڑی قدرت رکھتے ہیں۔ یہ ان کی گفتگو اور تحریر کی امتیازی شان ہے کہ ہزاروں اشعار ان کی یاداشت میں[illegible]ظ ہیں۔جنھیں وہ فی الفوراستعمال کرتے ہیں حافظہ کی یہ خدادانعمت خاکسار نے کہیں اورنہیں دیکھی۔ان کی شخصیت کا یہ پہلومخاطب کومرعوب کرتا ہےاوررشک ورقابت کے احساس سے بھی دوچارکرتا ہےمگران کا نیازمندانہ حسن سلوک اوراقدار کے سرچشموں سے سیراب وسرشارطبیعت ہرایک کونوروحضوروسرور کی دولت بیدار بخشتی ہے۔''درراہ دوست جلوہ است تازہ بہ تازہ

نو بہ نو‘‘ ۱۶؎

پرفیسر نحوی حقیقی معنوں میں مبارک بادی کے مستحق ہیں ان کی تصنیف وحدت الوجود اور اقبال پر حکیم منظور پروفیسر نحوی کو یوں مبارک باد پیش کرر ہے ہیں :

’’ڈاکٹر بشیر احمد نحوی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ انھوں نے اپنے بھر پور تبحر علمی، صدق تجسس اور خلوص تحقیق سے کام لے کر اس پیچیدہ مسئلہ کو آسان بنا کر پیش کیا ہے اور علامہ اقبال کے نظریہ کو قرآن وحدیث کے رموز کے سمندروں کی غواصی کے ساتھ ساتھ قدیم اور معاصر علماء ودانشوروں اور فلسفیوں کی آراء کو بے پناہ کوشش وکاوش کے ساتھ فراہم کر کے واضح کیا ہے اور برحق ثابت کیا ہے کہ یہ کتاب نہ صرف اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ علامہ اقبال کو علم حدیث پر بے پناہ عبور حاصل تھا، بلکہ اس امر کی بھی شہادت دیتی ہے کہ خود ڈاکٹر نحوی بھی اس بات میں کچھ کم نہیں اس کتاب کا ایک قابل ذکر وصف یہ ہے کہ یہ علماء اور طالبان علم دونوں کے لئے کارآمد بھی ہے اور قابل توجہ بھی۔ دست بہ دعا ہوں کہ یہ کتاب صحیح ہاتھوں میں پہنچ جائے اور اس کو وہ پزیرائی ملے جو اس کا حق ہے۔‘‘ ۱۷؎

سید رسول پونپر ان کے حوالے سے لکھتے ہیں :

''بشیر احمد نحوی کے یہاں علم وآ گہی کی صلاحیت بھی ہے اور محبت کی نرمی بھی۔ فارسی اور عربی زبان پر بھی انہیں قدرت ہے۔ وہ ایک فعال اور متحرک شخصیت کے مالک ہیں۔حوصلہ' عزم اور یقین کی بے بہا دولت بھی انہیں بہ حدِ وافر ودیعت ہوئی ہے۔ وہ اخلاقی قدروں کے امین اور گفتار وکردار دونوں کی تہذیب کے قائل بھی ہیں۔'' ۱۸۔

پروفیسر نحوی علم وادب کے علاوہ مذہبیات میں بڑی دلچسپی رکھتے ہیں جس میں انہیں حالی اور شبلی کا رنگ پسند ہے۔ ان کے اکثر مضامین اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ پروفیسر شوریدہ کاشمیری رقمطراز ہیں:

''ڈاکٹر نحوی کو علم وادب کے علاوہ مذہبیات سے بھی بڑی دلچسپی ہے۔ نگارشات میں شبلی اور حالی کا ملا جلا رنگ جھلکتا ہے مضامین خطابی، صحافتی، مقصدی واصلاحی نوعیت کے ہیں جن میں عموماً روانی اور برجستگی پائی جاتی ہے۔موقع پر معاشرہ کے مفاسد عنصروں پر نشتر زنی کرنے سے نہیں چوکتے۔'' ۱۹۔

پروفیسر نحوی اپنے خیالات کو آسان اور عام فہم انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ان کے طرز اسلوب میں طہارت، نفاست اور سادگی ملتی ہے۔ ڈاکٹر سید محمد فضل اللہ لکھتے ہیں:

''زبان کے مراتب پورے کرنے کے لئے اہل قلم کو دشت

تخیل کی سنگلاخ راہوں سے گزرنا پڑتا ہے اور موضوع سے انصاف کرنے کیلئے علمی زیور سے بھرپور آراستہ ہونا پڑتا ہے یہاں پر اس دشواری سے جناب نحوی صاحب ایسے نبرد آزما ہوتے ہیں کہ کامیابی وکامرانی ان کے گھر کی کنیز محسوس ہوتی ہے اس مذکورہ تصنیف میں پروفیسر موصوف نے اقبال کے کلام کی گتھیاں سلجھائی ہیں اور طالب علموں کے لئے اقبال شناسی آساں بن جاتی ہے۔عرفان ذات باری کی دولت بے کنار سے ملاقات ہوتی ہے حسن وعشق کے اصلی معنی نظر آتے ہیں اور تحقیق وتلاش کی حق ادائی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔'' ۲۰؎

سید مجید اندرابی ان کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''صاف گوئی ان کا شعار ہے۔ ہوا کے دوش پر آرزؤں کے محل تعمیر کرنا ان کی عادت نہیں بلکہ حق گوئی اصلاحِ معاشرہ، اخلاقیات کی پاسداری، خیالات کی ندرت، دین پسندی، خدا پرستی، انسان دوستی، مروت، شجاعت ومردانگی، اعلیٰ ظرفی، فراخ دلی، سوز وگداز، درد وکرب، اضطراب، ولولہ اور کہیں کہیں خطر پسندی وغیرہ ان کے ادائے اظہار میں شامل ہے۔نحوی مصلحت پسندی کے گورکھ دھندوں میں پھنسنے کے بجائے امت

مسلمہ میں پائے جانے والے اخلاقی انحطاط پر خون کے آنسو بہاتے ہیں۔ ان کے مضامین میں اصلاحی، اسلامی، تعمیری، انقلابی واجتہادی موضوعات کا خوبصورت امتزاج دیکھنے کوملتا ہے۔اظہار میں قوت جاذبیت کا یہ عالم ہے کہ قاری یک گونہ فکر کی رعنائیوں اورتوانائیوں میں سرمست ہوجاتا ہے'' ۔''کہیں کہیں بے باک نحوی طاغوتی نظام کے پرستاروں پر برسنے میں باک محسوس نہیں کرتا۔نحوی کے سینے میں دردمند دل دھڑکتا ہے۔ ان کے وجود کے سمندر میں متلاطم لہریں رواں دواں ہیں ۔ ساحل کو چھوڑنے تک ان کے فکری قلزم کے مدوجزرتواتر کے ساتھ منزل کی جانب کوشاں ہیں۔نحوی کی مظہری دنیا آلائشوں سے پاک ہے۔ وہ فکر کی تنگ دامنی سے نکل کر آفاقیت کے تناظر میں آباد بستیاں تعمیر کرنے کی تگ ودو میں ہیں۔ٹھوکریں کھا کربھی منزل مراد تک رسائی میں ہی عافیت سمجھتے ہیں۔کسی خاص مقام پر پہنچ کرنحوی زمان ومکان کے قید سے بالاتر ہوکر انسان کے اندر بوقلمونی ربوبی صفات دیکھنے کے آرزومند نظر آتے ہیں۔ان کی نظر میں گردش لیل ونہار عجب گل کھلاتی رہتی ہے اور کہیں کہیں ان کی نظروں میں زندگی کا کارواں آگے بڑھ رہا ہے۔ ہرصبح ، ہر

شام، ہر آن اور ہر لمحے نئے حالات وحادثات اور واقعات بطن ایام سے اپنی رنگارنگی وخوبصورتی کے ساتھ ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ ایک طرف نظر دوڑائیے تو تعمیر وترقی ،عیش پرستی، آرام پسندی اور جاہ طلبی کے مناظر رقص کرتے نظر آتے ہیں۔ ادھر ایک گھر تعمیر ہو رہا ہے اور اُدھر دوسرے کے آشیانہ پر بجلی گر رہی ہے۔ کہیں فکر ورائے کی آزادی چاہنے والوں کے حوصلے مل رہے ہیں اور کہیں حریت اور آزادی کے نام لیواؤں کو بندوقوں اور زہریلی گیسوں سے پیوند خاک کیا جا رہا ہے۔'' اقبال کا مداح ودیوانہ نحویؔ'' بنظر غائر حوادثِ زمانہ کا مشاہدہ کرتا ہے۔ یہ کرب ناک وروح فرسا کیفیت نحوی کو چین سے بیٹھنے نہیں دیتی تو یک لخت قلم کی تلوار ہاتھ میں لئے نبرد آزمائی کے لئے سینہ سپر ہو جاتے ہیں اور شب وروز کے حادثات کو اپنے مداح شاعر کی زبان میں یوں رقم کرتا ہے'' ۲۱ ؎

سلسلہ روز وشب نقش گرِ حادثات
سلسلہ روز وشب اصلِ حیات وممات
سلسلہ روز وشب تار حریر دورنگ
اس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات

ڈاکٹر سید فضل اللہ ان کے اسلوب بیان کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''جہاں پروفیسر بشیر احمد نحوی شگفتہ بیانی کے نباض کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں اور اپنے پنجہ تقدیس سے فصاحت کی کلائی پکڑ کر بلاغت کے عروج کے گُر بتاتے ہیں، وہاں وہ قلم کی اس گرفت کو ظاہر کرتے ہیں جس کی بناء پر مندرجہ بالا عنوان کا انتخاب کیا گیا ہے۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ انسان بزبانِ قلم بہت ساری باتیں کرتا ہے، اپنی طرح گتھیوں کو صفحہ قرطاس پر رکھتا ہے، اپنی اندرونی بے چینیوں اور کرب کو کاغذی لباس پہنا کر نقش فریادی بنا دیتا ہے۔ اپنی پاکیزہ اور لطیف روح کے ترنم خیز آبشاروں کے جھرنوں کی موسیقیت کو فردوس نگاہ و جنت گوش بنا دیتا ہے، یا اپنی خباثتوں کو معرض قرطاس میں لا کر ایک بار ہدایت پائی ہوئی دنیا میں کھلبلی مچا کر طیب کو خبیث بناتا ہے مگر جہاں تک قرآن حکیم کی اس آیت کریمہ '' ن والقلم و مایسطرون'' کا تعلق ہے، قلم اپنی عظمت کا نقارہ بن کر اپنے مسلک یعنی تحریر عبارتِ پاکیزہ کا داعی ہے۔'' ۲۲؎

پروفیسر نحوی جس قدر داخلی زندگی میں بلند ہیں۔ اسی قدر خارجی طور پر بھی ہیں۔ وہ جہاں علم و ادب میں اپنا ثانی نہیں رکھتے، وہیں وہ ایک فرماں بردار فرزند کی حیثیت سے اپنی

مثال آپ ہیں۔

سید محمد فضل اللہ کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

''پروفیسر نحوی صاحب خون اور گوشت پوس کے پیکر میں اعلیٰ جینیس (Genes) کے وارث نظر آتے ہیں اور پاکیزہ حسب ونسب کے تاروں میں بنے ہوئے اس جھالر کے مکین نظر آتے ہیں' جو صرف حسن بکھیرتا ہے۔'' ۲۳۔

حوالہ جات

۱۔اقبال افکار واحوال از بشیر احمد نحوی ص ۱۰۱
۲۔ایضاً۔۔۔۔۔ایضا۔۔۔۔ایضاً
۳۔اقبال افکار واحوال از بشیر احمد نحوی ص ۱۰۴
۴۔اقبال افکار واحوال از بشیر احمد نحوی ص ۱۰۹
۵۔ایضاً۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔ایضاً ص ۱۰۷
۶۔اقبال افکار واحوال از بشیر احمد نحوی ص ۱۰۵
۷۔ ایضاً۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔۔ص ۱۰۸
۸۔مضمون از سید مجید اندرابی غیر مطبوعہ
۹۔ا۔افکار واقبال از بشیر احمد نحوی ص ۱۰۲
۱۰۔اقبال افکار واحوال از نحوی ص ۱۰۷
۱۱۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔ایضاً ص ۱۰۳
۱۲۔مضمون از ڈاکٹر ریاض توحیدی غیر مطبوعہ
۱۳۔ایضاً۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً

۱۴۔ مضمون از ڈاکٹر سید محمد فضل اللہ غیر مطبوعہ
۱۵۔ مضمون از پروفیسر عبدالحق مطبوعات اقبال انسٹی ٹیوٹ سرینگر
۱۶۔ مضمون از پروفیسر عبدالحق مطبوعات اقبال انسٹی ٹیوٹ سرینگر
۱۷۔ بحوالہ وحدت الوجود اور اقبال از پروفیسر نحوی از پیش گفتار
۱۸۔ پیش آہنگ از سید رسول پونپر ص ۱۱۹۔۱۱۸
۱۹۔ قبال افکار واحوال از نحوی ص ۱۰۴
۲۰۔ مضمون از ڈاکٹر سید محمد فضل اللہ غیر مطبوعہ
۲۱۔ مضمون از سید مجید اندرابی مطبوعات اقبال انسٹی ٹیوٹ
۲۲۔ مضمون از ڈاکٹر سید محمد فضل اللہ غیر مطبوعہ
۲۳۔ مضمون از سید محمد فضل اللہ غیر مطبوعہ

اختتامیہ

بشیر احمد نحوی جنوبی کشمیر کے ضلع اسلام آباد (موجودہ اننت ناگ) کے تاریخی قصبہ

بجبہاڑہ میں ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ان کے دادا مولانا غلام مصطفیٰ مصفا اور والد غلام حسن اپنے زمانے کے اعلیٰ پایہ کے مبلغ دین اور ادیب وشاعر گزرے ہیں۔اس سے قبل بھی یہ خاندان کئی پشتوں سے تبلیغ دین کے کاموں میں سرفہرست رہا ہے۔بشیر احمد نحوی کی پرورش اور تربیت اسی علمی گھرانے میں ہوئی۔حسب روایت ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی اور مروجہ تعلیم اپنے قصبہ کے ایک اسکول سے حاصل کی۔انٹرمیڈیٹ کی تعلیم گونمنٹ ایم ایل ہائر اسکنڈری بجبہاڑہ سے حاصل کی اور گریشویشن اسلام آباد ڈگری کالج سے حاصل کی۔جہاں پروفیسر شوریدہ کاشمیریؔ جیسے معروف ومقبول شاعر کی تربیت نے بشیر احمد کو کافی متاثر کیا۔زمانہ طالب علمی ہی سے بشیر احمد نحوی کے بعض مضامین' اس وقت کے مشہور ومقبول''روزنامہ آفتاب'' میں چھپتے رہے۔مزید اپنے ادبی ذوق کو نکھانے میں کالج میگزین نے سہارا فراہم کیا۔

۱۹۷۵ کے بعد بشیر احمد نے شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی سے ایم۔اے اردو امتیاز کے ساتھ پاس کیا اور بعد میں ضلع اسلام آباد کے حنفیہ کالج میں بحیثیت مدرس کام کیا۔یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہ چل سکا اور انہوں نے اپنے اندر علمی وادبی ذوق وشوق کی تسکین کے لیے کشمیر یونیورسٹی کا ایک بار پھر رخ کیا اور ایم۔فل کی ڈگری شعبۂ اقبالیات سے حاصل کی۔دوران تعلیم ہی انہیں دوردرشن میں بحیثیت اسسٹنٹ پڑوسر تقرر کیا گیا۔لیکن کچھ عرصہ بعد شاہین پرواز رکھنے والے بشیر احمد نحوی نے اس مسحورکن ملازمت کو خیرباد کہہ دیا اور ایک بار پھر علمی وتحقیقی کام میں جٹ گئے اس طرح انہوں نے پروفیسر آل احمد سرور اور ضیاء الحسن

فاروقی کی مشترکہ نگرانی میں اپنا تحقیقی مقالہ صبطہ تحریر میں لاکر شعبۂ اقبالیات سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

بشیر احمد نحوی اقبال اور اقبالیات کے ایسے شیداؤں میں سے ہیں' جنہوں نے اس شعبۂ کو اپنی زندگی کا جز ولا ینفک [شعار] بنایا ہیں۔ اس شعبۂ میں ٹھوس علمی اور ادبی خدمات سے قبل وہ ایک دہائی سے گھر گھر' گلی گلی' گاؤں گاؤں' نگر نگر' مسجد مسجد اقبال کے پیغام کو پہچانے میں سرگرم عمل تھے۔ کشمیر میں اقبال اکیڈیمی کے بنیادی گوشے گزاروں میں بشیر احمد نحوی سرفہرست ہے۔ اس راہ کے پیچو پیچ کئی رکاوٹیں بھی آئی لیکن نحوی کے قوت عشق اور عزم بالجزم نے ان کے ارادوں کو کبھی بھی متزل نہیں ہونے دیا۔ وہ اقبالیاتی ادب اور ان کے پیغام کی ترجمانی کرتے رہے اور بالآخر اس خدمت کو منطقی انجام تک پہچانے کی سعی میں کامیابی سے ہمکنار ہوئے اور یہاں تک کہ وہ کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لیکچرر مقرر ہوئے۔ یہاں کئی سال کام کرتے رہے اور اپنے دل کے عبار کو بڑھانے اور اقبالیات کے ساتھ عشق کی حد تک شغف ہونے کی وجہ سے انہوں نے اپنا دائرہ عمل اور وسیع کر دیا' اس طرح انہیں اقبال انسٹی ٹیوٹ میں بحیثیت استاد عہدہ ملا اور بعد ازاں ترقی کرتے کرتے شعبۂ اقبالیات کے ڈائریکٹر بن گئے۔ اس طرح انہیں اوپن میرٹ کی بنیادوں میں پروفیسر کے عہدے سے سرفراز کیا گیا۔ آج کل بشیر احمد نحوی اسی شعبۂ کے دوبارہ ڈائریکٹر منعقد کئے گئے' ساتھ ساتھ ہی وہ جنوبی کیمپس کشمیر یونیورسٹی کے دائریکٹر کی حیثیت سے بھی اپنی خدمات پیش کر رہیں ہیں پروفیسر بشیر احمد نحوی کی زندگی کا نصب العین احترام آدمیت کے مفروضے پر قائم ہیں۔

انھوں نے اپنے ادبی سفر میں اپنے ہمعصروں سے برعکس اسی دشت کی سیاحی کی ۔اپنے ادبی سفر میں بشیر احمد نحوی نے اپنے بعض معاصرین سے اثر بھی لیا اور انہیں بھی براہ راست متاثر کیا۔ پروفیسر نحوی نے جب شعبۂ اقبالیات کی ادرات سنبھالی' تو انھوں نے اقبال کے نور بصریت کو عام کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ۔انھوں نے متعدد سمینار' مباحث' مذاکرات' لیکچرز کا انعقاد کرایا۔جن میں نہ صرف ریاست کے اصحاب علم و دانش کو مدعو کرتے رہے بلکہ بیروں ریاست کے سرکردو ادباء و دانشوروں کی خدمات سے فیض یاب ہونے کی مستند کوشش کی ۔ جہاں بشیر احمد نحوی نے دوسرے اصحاب سے ریاست میں اس شعبۂ کے داۂ کار کو بڑھانے میں مدد لی' وہیں انھوں نے اپنی زندگی کی ہر صبح و شام کو اس فکر کی ترسیل و ابلاغ میں صرف کیں ۔ پروفیسر نحوی نے عملی' علمی و ادبی سطح پر اقبال اور مطالعات اقبال میں گراں قدر کام کیا ہے ۔انھوں نے مطالعات اقبال کو اس کے صحیح تناظر میں عام قارین تک پہچانے کے لئے سہل اور صاف گوئی کا استعمال کیا ہے ۔اس مقصد کی حصولیابی کے لئے انھوں نے عربی فارسی' اردو' کشمیری' انگریزی زبانوں پر کامل دسترس حاصل کی ۔

ریاست میں اقبالیاتی ادب کا جب بھی جائزہ لیا جائے گا' تو پروفیسر نحوی کا ذکر خیرہ کرنا اس محفل میں ناگزیر ہیں ۔ پروفیسر نحوی حافظ اقبال مشہور و مقبول ہیں ۔ وہ اپنی تحریر اور تقریر سے جادو جگانے کا فن جانتے ہیں ۔ ان کی تمام تصانیفات کا لب لباب کلام اقبال' فکر اقبال کے آئینہ میں صالح قدروں کی تشہیر اور عوام و خواص میں احترام آدمیت' اخوت' ایثار' جذبہ صداقت کا فروغ دینا ہیں ۔اس ضمن میں ان کی تصانیف'' نظریہ تصوف اور اقبال'' ایک

شہکار مثال ہے۔ اسی طرح اقبال اور عرفان کی آواز' میں پروفیسر نحوی نے کلام اقبال کی گتھیاں ایسے سلجھائی ہیں کہ طالب علموں کے لئے اقبال شناسی آسان بن جاتی ہے۔ پروفیسر نحوی کی ایک اور کتاب اقبال ایک تجزیہ ۲۰۰۳ء میں منظر عام پر آئی۔ اس میں علامہ کے بنیادی تصورات اور مقاصد کی بازیافت کی گئی ہیں۔ اسی طرح ان کی دیگر تصانیفات میں محسوسات' احساس وادراک پیش پیش ہیں۔ ان میں نحوی کے ہلکے پھلکے اور بعض مختصر مضامین شامل ہے۔ علاوہ ازین پروفیسر نحوی نے متعدد کتابیں تالیف (مرتب) کی ہیں' جن کا بنیادی مقصد اقبال کے نور بصریت کو عام کرنا اور ملتِ اسلامیہ کو اپنی شاندار تاریخ کی یاددہانی کر کے انہیں اعلیٰ صفت کا قائل بنانا اور بھٹکے ہوئے لوگوں کو صراۃ مستقیم دیکھانے کی کوشش کرنا ہیں۔ بشیر احمد نحوی ایک کالم نویس کی حیثیت سے بھی اپنی ایک امتیازی شان رکھتے ہیں۔ وہ آئے دن کسی نہ کسی موضوع 'مسلہ' شخصیت' تجربہ پر لب کشائی کرتے ہیں۔ ان کے مضامین میں عصری دور کے سیاسی' سماجی' معاشی اور معاشرتی بالادستی اور اقوام عالم پر ظلم وتعدی' حق تلفی اور ناانصافی کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے ہوئے انسانیت پرستی' اخوت' احترام آدمیت متوازن تقسیم دولت' تزکیہ نفس وقلب و ذہن اور ارتفاع اقدار کے عظیم اصولوں کی ترجمانی کا جامع درس ملتا ہیں۔ ان کے مضامین کے فکری پہلو کی اساس قرآن وسنت کے علاوہ علامہ اقبال کے فلسفے میں ہیں' انہی کی روشنی میں بشیر احمد نحوی اپنے خام مال کو دوآتشہ کر دیتے ہیں۔ مختصراً ان کی ہر آہ اور واہ میں اقبال بسا ہوا ہے۔ اور یہی ان کی پہچان بھی ہے۔ غالباً ڈاکٹر جمیل جالبی کا یہ قول یہاں پر دہرانہ بے جانہ ہوگا کہ اقبال کا کلام ایک

وسیع تر کائنات کا نغمہ تخلیق ہے، اور اس نغمہ تخلیق کا آہنگ پروفیسر بشیر احمد نحوی کی اقبال شناسی ہے۔

شام در شام جلیں گے تری یادوں کے چراغ
نسل در نسل ترا درد نمایاں ہوگا

کتابیات

کتابیات

نمبر شمار	مصنف/مرتب	عنوان کتاب	ناشر و سنہ اشاعت
۱	آزاد جان محمد	جموں و کشمیر کے اردو مصنفین	جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر ۲۰۰ء
۲	آزاد جگن ناتھ	اقبال اور کشمیر	مکتبہ علم و دانش لاہور ۱۹۹۳ء
۳	آزاد جگن ناتھ	فکر اقبال کے بعض اہم پہلو	شاہین پبلشرز سرینگر ۱۹۹۴ء
۴	آزاد جگن ناتھ	ہندستان میں اقبالیات	اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی

(آزادی کے بعد) ۱۹۸۹ء سرینگر

۵ آفتاب اشرف اردو زبان وادب اور صوفیائے بہار ایجوکیشنل ہاؤس دہلی ۲۰۰۸ء

۶ اشرف آثاری رنگ وآہنگ (ا) صبا پبلی کیشنز سرینگر ۲۰۱۴ء

۷ اشرف آثاری علامہ اقبال اور مرزائیت ایضاً ایضاً

۹ بدرالدین بٹ جامعہ کشمیر اور اقبالیات اقبال انسٹی ٹیوٹ سرینگر ۲۰۰۹ء

۱۰ بشیر احمد نحوی (مرتب) ارمغان نحوی مخدومی پرنٹرس سرینگر ۲۰۰۷ء

۱۱ بشیر احمد نحوی اقبال عرفان کی آواز ادارہ علم وادب بجبہاڑہ کشمیر ۲۰۰۲ء

۱۲ بشیر احمد نحوی اقبال ایک تجزیہ اقبال انسٹی ٹیوٹ سرینگر ۲۰۰۰ء

۱۳ بشیر احمد نحوی (مرتب) تاریخ الانبیاء ادارہ علم وادب بجبہاڑہ کشمیر ۲۰۰۳ء

۱۴ بشیر احمد نحوی احساس وادراک میزان پبلیشرز سرینگر ۲۰۱۱ء

۱۵ بشیر احمد نحوی محسوسات میزان پبلیشرز سرینگر

۱۶ بشیر احمد نحوی مسائل تصوف اور اقبال ادارہ علم وادب بجبہاڑہ کشمیر ۲۰۰۱ء

۱۷ بشیر احمد نحوی (مرتب) نفحات اقبال اقبال انسٹی ٹیوٹ سرینگر ۲۰۰۱ء

۱۸ بشیر احمد نحوی (مرتب) وہ دانائے سبل ختم الرسل ایضاً ۲۰۰۰ء

۱۹ بشیر احمد نحوی اقبالیات۔۔گزشتہ دس سال ایضاً ۲۰۰۴ء

۲۰ بشیر احمد نحوی (مرتب) اقبالیات شمارہ ۱۲ تا ۲۰ ایضاً

۲۱ بشیر احمد نحوی (مرتب) حکیم مشرق ایضاً ۱۹۹۸ء

۲۲ بشیر احمد نحوی (مرتب) اقبال بحر خیال ایضاً ۲۰۰۷ء

۲۳ بشیر احمد نحوی (مرتب) اقبال کی تجلیات ایضاً ۲۰۰۲ء

۲۴ بشیر احمد نحوی (مرتب) فکر آزاد ایضاً ۲۰۰۶ء

۲۵ بشیر احمد نحوی وحدت الوجود اور اقبال ادارہ ترقی علم و ادب بجبہاڑہ کشمیر ۱۹۹۲ء

۲۶ بشیر احمد نحوی اقبال افکار و احوال ایضاً ۱۹۸۹ء

۲۷ بشیر احمد نحوی (مرتب) iqbals multiformity اقبال انسٹی ٹیوٹ سرینگر ۲۰۰۱ء

۲۸ بشیر احمد نحوی (مرتب) iqbal,s religio- philosphical Ideas اقبال انسٹی ٹیوٹ سرینگر ۲۰۰۳ء

۲۹ پریمی رومانی اقبال اور جدید شاعری کریسنٹ ہاوس پبلی کیشنز جموں ۲۰۰۴ء

۳۰ تسکینہ فاضل اقبال نقش ہائے رنگ رنگ فاضل پبلی کیشنز سرینگر ۲۰۰۴ء

۳۱ تسکینہ فاضل اقبال اور مطالعات اقبال ایضاً ۲۰۰۷ء

۳۲ تسکینہ فاضل اقبال اور اقبالیات (ایک منظر نامہ) ایضاً ۲۰۱۲ء

۳۳ جوہر قدوسی اردو زبان و ادب کی ترویج میں اردو صحافت کا رول (۴۷ کے بعد) ٹی ایف سی پبلشرز سرینگر ۱۹۹۴ء

۳۴ چستی یوسف سلیم (شارح) ارمغان حجاز اعتقاد پبلشنگ ہاوس دہلی ۲۰۰۹ء

۳۵ چستی یوسف سلیم (شارح) اسرار خودی ایضاً ۱۹۹۸ء

۳۶ چستی یوسف سلیم (شارح) بال جبریل ایضاً ۲۰۰۱ء

۳۷ چستی یوسف سلیم (شارح) پیام مشرق ایضاً ۱۹۹۳ء

۳۸ چستی یوسف سلیم (شارح) رموز بیخودی ایضاً ۱۹۹۷ء

۳۹ حامدی کشمیری اقبال کا تخلیقی شعور اقبال انسٹی ٹیوٹ سرینگر ۲۰۰۱ء

۴۰ حامدی کشمیری ریاست جموں و کشمیر گلشن پبلیشرز سرینگر ۱۹۹۱ء

میں اردو ادب

۴۱	حکیم منظور	اقبال ایک تذکرہ	ایضاً ۲۰۰۰ء
۴۲	خان رشد حسن	ادبی تحقیق (مسائل اور تجزیہ)	علی گڑھ ایجوکیشنل ہاوس ۱۹۷۸ء
۴۳	خاور محمد عبداللہ	مفتاح اقبال (حصہ اول)	اقبال انسٹی ٹیوٹ
۲۰۰۲ء			
۴۴	خاور محمد عبداللہ	مطبوعات اقبال انسٹی ٹیوٹ (ایک توضیحی اشاریہ)	ایضاً ۱۹۹۹ء
۴۵	خلیفہ عبدالحکیم	فکر اقبال	علی گڑھ ایجوکیشنل ہاوس
۲۰۰۲ء			
۴۶	خیال غلام نبی	اقبال اور تحریک آزدیٔ کشمیر	کشمیر رائٹرس کانفرنس سرینگر ۱۹۹۷ء
۴۷	ریاض توحیدی	جہان اقبال	میرزان پبلیشرز سرینگر
۲۰۱۰ء			
۴۸	سرور آل احمد	دانشور اقبال	ایجوکیشنل ہاوس علی گڑھ ۲۰۰۱ء
۴۹	سروری عبدالقادر	کشمیر میں اردو (تین جلد)	جے۔کے آفسیٹ پرنٹرز دہلی ۱۹۸۴ء
۵۰	سید وحیدالدین	اقبال اور مغربی فکر	اقبال انسٹی ٹیوٹ سرینگر ۱۹۸۱ء
۵۱	عازم پیر نصیر احمد	کشمیر میں اقبال شناسی کا سفر	میزان پبلیشرز سرینگر
۲۰۱۲ء			
۵۲	عازم پیر نصیر احمد	مرغوب بانہالی بحیثیت اقبال شناس	ایضاً ۲۰۱۲ء
۵۳	فرمان فتح پوری	اقبال سب کے لئے	ایجوکیشنل ہاوس دہلی ۲۰۰۰ء